خلیج ڈائری

خلیج کی جنگ کے سبق آموز پہلو

مولانا وحید الدین خاں

خلیج ڈائری

خلیج کی جنگ کے سبق آموز پہلو

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

پیش لفظ

میرا معمول ڈائری لکھنے کا ہے۔ پہلے میں کبھی کبھی متفرق طور پر کچھ یادداشتیں لکھ لیتا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۸۳ سے یہ میرا مستقل معمول بن گیا ہے۔ اب میں ہر روز ڈائری کا ایک صفحہ لکھتا ہوں۔ اس طرح میری ڈائریوں کا ایک بڑا ذخیرہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ انشاء اللہ ان کو دو دو سال کے مجموعہ کی صورت میں مختلف جلدوں میں شائع کیا جائے گا۔

خلیج کا بحران (۱۹۹۰) شروع ہوا تو قدرتی طور پر میری ڈائری میں اس سے متعلق تاثرات درج ہونے لگے۔ میں روزانہ انگریزی، عربی اور اردو اخبارات اور رسالے بڑی تعداد میں پڑھتا۔ پھر اپنے مزاج کے مطابق، ہر روز کوئی ایک سبق کی بات لے کر اس کو ڈائری کے طور پر لکھ لیتا۔ اِس طرح اُس کی بابت ایک پورا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اس ذخیرہ کو "خلیج ڈائری" کے نام سے الرسالہ مئی ۱۹۹۱ میں شائع کیا جا چکا ہے۔

یہی مجموعہ اب کتاب کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ کتاب کی صورت میں چھاپتے ہوئے اس میں دو اضافے کر دئے گئے ہیں۔ یہ اضافے ڈائری کے مضامین کا خلاصہ بھی ہیں، اور ان کی روشنی میں مستقبل کے تعمیری کام کا نقشہ بھی۔

"خلیج ڈائری" معروف معنوں میں خلیج کی جنگ کا کوئی روزنامچہ نہیں ہے۔ وہ صرف سبق آموز تاثرات کا مجموعہ ہے۔ اس میں متفرق طور پر جنگ کے بعض پہلوؤں کو لے کر اس سے سبق اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے اندراجات میں تاریخ کی ترتیب صرف راقم کے تاثرات کی تاریخ کو بتاتی ہے نہ کہ خود جنگی واقعات کی تاریخی ترتیب کو۔

سبق اخذ کرنے کے لئے اس میں دو طریقے استعمال کئے گئے ہیں۔ کہیں براہ راست طریقہ، یعنی جنگ کے واقعہ سے خود جنگ کا سبق لینا۔ مثلاً ۴ فروری کا مضمون۔ اور کہیں بالواسطہ طریقہ، یعنی جنگ کے واقعہ سے غیر جنگی سبق اخذ کرنا۔ شلاً ۱۵ جنوری کا مضمون۔ یہ دونوں ہی طریقے عالمی ادب میں رائج اور مسلّم ہیں۔

وحید الدین ۲۳ اپریل ۱۹۹۱

۱۵ جنوری ۱۹۹۱

۱۵ جنوری ۱۹۹۱ کے اخبارات یہ خبر لائے کہ آج رات کو گیارہ بج کر انسٹھ منٹ (11.59) پر وہ ڈیڈلائن ختم ہو جائے گی جو کویت سے عراقی فوج ہٹانے کے لیے اقوام متحدہ نے مقرر کی تھی۔ اس کے بعد فوراً امریکہ کو یہ حق ہو جائے گا کہ وہ عراق پر اپنی پوری طاقت کے ساتھ حملہ کر دے۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۵ جنوری) کے ایڈیٹوریل کی سرخی تھی ـــــ الٹا شمار صفر پر پہنچنے والا ہے :

Countdown to zero

امریکی نیوز ایجنسی اے پی کے نمائندہ نے سعودی عرب میں اس مقام کا دورہ کیا جہاں امریکہ نے فوجی اڈہ بنایا ہے۔ یہاں انتظام کیا گیا ہے کہ جنگ شروع ہونے کی حالت میں عراق کے اوپر رات دن مسلسل بمباری کی جائے تاکہ یا تو صدر صدام حسین ہتھیار ڈال دیں یا عراق کو اسٹون ایج میں پہنچا دیا جائے۔

اے پی کے نمائندہ سے گفتگو کرتے ہوئے امریکی میجر کوگلان (J.J. Coghlan) نے کہا کہ یہاں ہر آدمی اپنی گھڑی کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے تاکہ یہ معلوم کرے کہ ۱۵ تاریخ کو کون سا دن ہے۔ ہر ایک اپنے آپ کو ارجنٹ صورت حال میں محسوس کر رہا ہے :

Everybody looks at the watch all the time to see which day the 15th is. There's a sense of urgency.

جس طرح اقوام متحدہ کے رزولیوشن ۶۷۸ (۲۹ نومبر ۱۹۹۰) کے مطابق، امریکہ نے عراق کو الٹی میٹم دیا کہ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک کویت سے اپنی فوجیں ہٹا لے، ورنہ اس کے اوپر حملہ کر کے اس کو برباد کر دیا جائے گا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موجودہ دنیا کی ایک عمر مقرر کر دی ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ اس متعین وقت تک لوگ اپنی اصلاح کر لیں۔ اس کے بعد دنیا کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ اور ہر ایک کو مجبور کیا جائے گا کہ وہ خدا کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے عمل کا حساب دے۔

اگر لوگوں کو اس خدائی اعلان کا شعور ہو تو ہر آدمی ارجنسی کے احساس (sense of urgency) میں زندگی گزارنے لگے۔ ہر آدمی اپنا محاسبہ کرنے میں لگ جائے۔ ہر آدمی اپنے قول و عمل کا نگراں بن جائے۔ ہر آدمی اپنا دن اس طرح گزارے گویا کہ وہ شام تک نہیں رہے گا۔ اور شام اس طرح گزارے گویا اگلی صبح اس کے لیے آنے والی نہیں۔ لوگ قیامت کے آنے سے پہلے اپنے آپ کو قیامت میں کھڑا ہوا محسوس کرنے لگیں۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۱

آج کل سب سے بڑا موضوع خلیج کا بحران ہے۔ ہر شخص عراق اور کویت کے مسئلہ پر بات کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ عراق ایک بڑا ملک ہے اور کویت اس کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ملک۔ عراق کا رقبہ ۱۶۸۸۸۰ مربع میل ہے۔ جب کہ کویت کا رقبہ صرف ۶۸۸۰ مربع میل۔ عراق نے اپنی تیل کی دولت کے بڑے حصہ کو فوجی مدوں میں خرچ کر کے ۱۰ لاکھ کی طاقت ور فوج بنالی ہے، دوسری طرف کویت کے پاس عملاً کوئی فوج نہیں۔ اس فرق سے فائدہ اٹھا کر عراق کے حکمراں صدام حسین نے اپنی ایک لاکھ فوج ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت کے اندر داخل کر دی۔ انھوں نے بزور کویت کو عراق میں ملا کر اعلان کر دیا کہ "کویت عراق کا ۱۹ واں صوبہ ہے"۔

اس کے بعد اقوام متحدہ متحرک ہوئی۔ مختلف ملکوں نے عراق کے اس جارحانہ اقدام کی مذمت کی۔ یہاں تک کہ امریکہ کی قیادت میں پورے عراق کا فوجی محاصرہ کر لیا گیا۔ عراق کی ۹۵ فی صد آمدنی کا انحصار تیل کی فروخت پر ہے۔ مگر عراقی تیل سے بھرے ہوئے ٹینکر سمندر میں کھڑے ہو گئے، زرعی اور صنعتی پسماندگی کی وجہ سے عراق فوجی ہتھیاروں سے لے کر دوا اور غذا تک ہر چیز باہر سے منگاتا ہے، ان کا آنا بھی بند ہو گیا۔ اب عراق کے حکمراں صدام حسین روزانہ امریکہ کے خلاف تیز و تند بیانات جاری کر رہے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۱ اگست ۱۹۹۰) کے مطابق، صدام حسین نے اس تجویز کو نامنظور کر دیا کہ وہ کویت کی حیثیت کے بارہ میں امریکہ سے بات چیت کریں۔ انھوں نے پُر جوش طور پر کہا کہ کیا کویت امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ ہے:

Is Kuwait the 52nd state of the United States?

جواب کی یہی قسم ہے جس کو دھاندلی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کویت اگر امریکہ کا ۵۲ واں صوبہ نہیں تو وہ عراق کا بھی ۱۹ واں صوبہ نہیں۔ صدام حسین عین اسی چیز کے لیے امریکہ کو متہم کر رہے ہیں جس میں وہ خود شدید تر انداز میں مبتلا ہیں۔

آج دنیا کے بیشتر لوگ اسی قسم کی دھاندلی کر رہے ہیں۔ کاش لوگ جانتے کہ اُسی بات کی قیمت ہے جو خدا کے یہاں قیمتی ٹھہرے۔ مومن وہ ہے جو اُن الفاظ کو آج ہی بے قیمت سمجھ لے جو کل خدا کے یہاں بے قیمت ہونے والے ہیں۔ جو آج آزادانہ طور پر اُس بات کو مان لے جس کو کل وہ مجبورانہ طور پر مانے گا، مگر اس وقت کا ماننا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

۱۷ جنوری ۱۹۹۱

ہندستانی وقت کے مطابق، آج صبح ساڑھے تین بجے وہ وقت آگیا جس کا اندیشہ تھا۔ امریکی فوجوں نے عراق کے اوپر باقاعدہ حملہ کردیا۔ فجر کی نماز سے پہلے بی بی سی (لندن) کے ذریعہ ریڈیو سے یہ خبر معلوم ہوگئی۔ یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ رات کے وقت عراق میں ایک واقعہ ہوتا ہے۔ اس کے چند منٹ بعد لندن سے اس کی خبر نشر ہو جاتی ہے اور ایک لمحہ کے اندر ساری دنیا اس کو جان لیتی ہے۔

اپنی مختصر سی زندگی میں دو بڑی جنگیں دیکھنا میرے لیے مقدر تھا۔ دوسری عالمی جنگ جس کا قائد برطانیہ تھا۔ اور پھر موجودہ جنگ جو گویا تیسری عالمی جنگ ہے اور جس کی قیادت امریکہ کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ۲۸ ملک عملاً شریک ہیں۔ بقیہ ملکوں کی اکثریت بھی نظری طور پر شریک ہے، کیوں کہ امریکہ نے یہ جنگی اقدام اقوام متحدہ کے فیصلہ کے تحت کیا ہے۔ دوسری عالمی جنگ باقاعدہ طور پر یکم ستمبر ۱۹۳۹ کو شروع ہوئی جب کہ ہٹلر کے تحت جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ چند دن کے بعد الٰہ آباد کے انگریزی اخبار پانیر (pioneer) نے اپنے پہلے صفحہ پر اس کی خبر دیتے ہوئے اس کی جو سرخی قائم کی وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ اس کے الفاظ غالباً یہ تھے :

Poland in Germany's hand

یہ تباہ کن جنگ چند سال تک جاری رہی۔ بے شمار جانی و مالی نقصان کے بعد آخر کار جو ہوا وہ یہ کہ ہٹلر کی خودسری مایوسی میں تبدیل ہوگئی۔ ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ کو اس نے اپنی محبوب عورت کے ساتھ برلن کے کھنڈر پر خودکشی کر لی :

> Isolated and reduced to despair, Hitler married his mistress, Eva Braun, on April 30, 1945 and comitted suicide with her in the ruins of the chancellery. (19/1011)

بظاہر حالات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عراق کے ڈکٹیٹر کا انجام بھی ایک یا دوسری صورت میں وہی ہونے والا ہے جو جرمنی کے ڈکٹیٹر کا ہوا تھا۔ عراق کی طاقت اور امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کی طاقت میں وہی فرق ہے جو چیونٹی اور ہاتھی میں ہے۔ اس فرق کے ساتھ عراق کا جنگ میں کودنا صرف خودکشی ہے نہ کہ بہادری۔

عراق کے پاس زیادہ تر روایتی ہتھیار ہیں جو اس نے روس سے یا دوسرے مغربی ملکوں سے خرید کر حاصل کیے ہیں جب کہ امریکہ کے ہتھیار اس کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ "خریدے ہوئے" ہتھیاروں کے ذریعہ کوئی ملک ایک ایسی قوم پر فتح حاصل نہیں کر سکتا جس نے اپنے ہتھیار خود بنائے ہوں۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۸ جنوری) میں مسٹر رے (A.K. Ray) کا ایک مضمون چھپا ہے۔ مضمون نگار نے صدام حسین کے اقدام کو دیوانگی (madness) اور احمقانہ قسم کا غلط اقدام (stupid misadventure) بتایا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ صدام حسین کی عظیم فوج کے بارہ میں حال میں جو خبریں چھپی ہیں، وہ سب پروپگنڈے کی باتیں (propaganda ploy) ہیں۔ عراقی صدر کو اپنے غلط اعمال کی بھاری قیمت دینی ہوگی :

> The Iraqi President will have to pay a terribly heavy price for his wrongdoings. (p. 13)

مضمون نگار کی یہ بات لفظ بلفظ درست ہے۔ صدام حسین کا اقدام بلاشبہہ ہلاکت کی چھلانگ ہے۔ صدام حسین جنون عظمت (paranoia) کے مریض ہیں۔ وہ عرب لیڈر بننے کے خبط میں مبتلا ہیں۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ کیا تاکہ الجیرز ٹریٹی (۱۹۷۵) کو ختم کر کے شط العرب نیز خوزستان پر قبضہ کر لیں۔ مگر اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ ایک ملین انسان مارے گئے۔ بے شمار لوگ زخمی ہوئے۔ عراق کے اوپر ۸۲ بلین ڈالر کا قرض ہوگیا۔ کویت پر حملہ (۲ اگست ۱۹۹۰) کے وقت ہر عراقی باشندہ ۴۸۲۴ ڈالر کا مقروض تھا۔ وغیرہ

آٹھ سالہ جنگ میں صدام حسین ایران کو مغلوب نہیں کر سکے تھے۔ مگر اپنے مجنونانہ جوش کی بنا پر انھوں نے اس سے سبق نہیں لیا۔ اور دوبارہ ناقابل فہم حماقت کے تحت عالمی سپر پاور (امریکہ) سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

اس وقت ساری دنیا کے مسلم عوام جذباتی طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ صدام حسین آج مسلم دنیا کے ہیرو ہیں۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے عام مسلمان بھی اسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہیں جس میں صدام حسین مبتلا ہیں۔ وہ اپنے جنون عظمت کی تسکین کے لیے صدام کے حامی بن گئے ہیں۔ حقیقی اسلام آدمی کو متواضع بناتا ہے۔ مگر خود ساختہ اسلام آدمی کی انا کو جگا کر اس کو جنون عظمت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہی موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اپنی اس کمزوری کی بنا پر وہ حقیقت پسندی سے دور ہو گئے ہیں۔ وہ ہر اس آدمی کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں جو بڑے بڑے الفاظ بولے۔ خواہ عالم واقعہ میں ان الفاظ کی کوئی قیمت نہ ہو۔

۱۹ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ میں پہلی بار جدید وارفیر کی وہ صلاحیت سامنے آئی ہے جس کو عین نشانہ پر بمباری (pinpoint bombing) کہا جاتا ہے۔ الائیڈ فورس نے بغداد کی ڈیفنس بلڈنگ پر بم مارنا چاہا تو عین اسی مخصوص بلڈنگ پر بم گرا، جب کہ وہاں سیکڑوں دوسری بلڈنگیں بھی موجود تھیں۔ حتی کہ ٹی وی کے گنبد کو نشانہ بنایا تو ان کا بم صرف گنبد سے ٹکرایا اور بقیہ عمارت کو چھوڑ دیا۔ وغیرہ

لندن کی ایک رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا ۱۹ جنوری) میں کہا گیا ہے کہ اب تک عراق پر چار ہزار ہوائی حملے کیے جا چکے ہیں۔ موصولہ تصویریں بتاتی ہیں کہ یہ حملے عین نشانہ پر لگے۔ اس انتہائی صحیح حملہ نے یہاں فوجی لوگوں کے اندر تموج کی کیفیت پیدا کر دی ہے:

> At least four of these 4,000 air sorties yielded pictures of the sequence of highly accurate attacks that thrilled the military community, heralding a new era in warfare.

عین نشانہ پر بم کا گرنا ایک بے حد پیچیدہ عمل ہے۔ یہ ابھی تک ایک فوجی راز ہے۔ سادہ طور پر اس کا نظام یہ ہے کہ پہلے سٹلائٹ کے ذریعہ مطلوبہ مقام کا فوٹو لیا جاتا ہے۔ پھر زیر نشانہ عمارت کی تصویر کو ہوائی جہاز میں لگے ہوئے کمپیوٹر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاز فضا میں اڑ کر لیزر شعاعوں کے ذریعہ مذکورہ مقام کو معلوم کرتا ہے۔ کمپیوٹر کے اندر فیڈ کی ہوئی تصویر جب نشانہ کی تصویر سے مطابقت کرتی ہے تو کمپیوٹر مشین کو متحرک کرتا ہے اور بم اس تصویری نشانہ پر جا گرتا ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ اور تفصیلی عمل صرف منٹوں کے اندر انجام پاتا ہے۔

فوجی لوگ جب اس قسم کے واقعات کو دیکھتے ہیں تو ان کے اندر جدید ٹکنالوجی کے بارہ میں تھرل (تموج) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اُس خدا کی قدرت پر تھرل کی کیفیت پیدا ہو جس نے کائنات میں اس قسم کے حیرت انگیز امکانات رکھے اور وہ انسانی ذہن بنایا جو اِن امکانات کو استعمال کرکے ایسے کارنامے انجام دے سکے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ وہ عجائب (marvels) جو خالق کی یاد دلانے والے تھے، ان سے انسان صرف مخلوق کی یاد کی غذا حاصل کر رہا ہے۔ ان واقعات سے اگر صحیح سبق لیا جائے تو انسانی دنیا میں ایک حیرت ناک انقلاب برپا ہو جائے۔

۲۰ جنوری ۱۹۹۱

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۱۸ جنوری) کے پہلے صفحہ پر ایک خبر نمایاں سرخی کے ساتھ چھپی تھی کہ کراچی سے خیبر تک تمام پاکستانی مسلمان امریکہ کی مخالفت اور صدام حسین کی حمایت میں متحد ہو گئے۔ اسی اخبار میں "امریکہ دشمن نمبر ا" کے عنوان کے تحت ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے:

"امریکہ کے صدر بش کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی بدولت پاکستان کے تمام طبقے اور تمام مکاتب فکر پہلی دفعہ امریکہ دشمنی کے حوالے سے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گئے ہیں۔ اس وقت پوری پاکستانی قوم امریکہ کو عالم اسلام کا دشمن نمبر ا سمجھ رہی ہے۔ سمجھتی تو شاید پہلے بھی رہی ہے۔ لیکن اس کا بھرپور اور متفقہ اظہار پہلی دفعہ (امریکہ کے عراق پر حملہ کے بعد) ہو رہا ہے۔" (صفحہ ۲)

آج کل مسلمانوں کے اخباروں میں بار بار ایسی رپورٹیں اور مضامین چھپ رہے ہیں جن میں "عالمی اسلامی اتحاد" کی خبر دی جاتی ہے۔ مگر یہ اتحاد محض ایک منفی اجتماع ہے۔ اور منفی اجتماع اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی اتحاد نہیں۔ وہ محض ایک وقتی قسم کی بھیڑ ہے نہ کہ کوئی حقیقی اور پائدار اتحاد۔ اس قسم کا اتحاد صرف قوم کی کمزوری کو بتاتا ہے نہ کہ فی الواقع اس کی قوت و طاقت کو۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں جب بھی کوئی بڑا اتحاد ہوا ہے، وہ منفی بنیاد پر ہوا ہے بیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر ہند کے مسلمان "خلافت" کے نام پر متحد ہوئے۔ مگر یہ کوئی مثبت اتحاد نہ تھا، وہ صرف انگریز دشمنی کے جذبہ کے تحت ظہور میں آیا تھا۔ اسی طرح موجودہ صدی کے وسط میں مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے متحد ہو گئے۔ یہ اتحاد بھی کوئی مثبت واقعہ نہ تھا۔ وہ تمام تر ہندو دشمنی کے جذبہ کے تحت برپا ہوا تھا۔ اب صدی کے آخر میں مسلمان پھر متحد نظر آرہے ہیں۔ مگر یہ اتحاد بھی صرف امریکہ دشمنی کے جذبہ کے تحت ظاہر ہوا ہے، اس اتحاد کے پیچھے کوئی مثبت بنیاد موجود نہیں۔ اس لیے وہ باقی رہنے والا بھی نہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اس قسم کے اتحادی واقعات پر بار بار خوشبوں کے چراغ جلاتے ہیں۔ مگر شام کے جلائے ہوئے چراغ صبح کو بجھ جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ملت بدستور اختلاف وانتشار کے اندھیروں میں ڈوبی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔

مثبت بنیاد پر جمع ہونا حقیقی اتحاد ہے، منفی بنیاد پر جمع ہونا محض ایک بے معنی بھیڑ۔ اتحاد کسی قوم میں شعوری عمل سے آتا ہے اور بھیڑ صرف جذباتی الفاظ سے۔

۲۱ جنوری ۱۹۹۱

ٹائم (۱۵-۲۱ جنوری) "گلف اسپشل" کے طور پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ امریکہ اور عراق دونوں اپنی آخری حد پر جا چکے ہیں، اور بظاہر اب دونوں فریق جنگ کے لیے تیار ہیں، کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی اس مفروضہ بدنامی کو اپنے اوپر لینا نہیں چاہتا کہ اس نے دوسرے کے آگے ہتھیار ڈال دیے (۹-۱۰)

ٹائم نے لکھا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں غیر مشروط طور پر واپس بلالیں، تو یہ ان کے لیے آخری بہترین انتخاب (choice) ہوگا۔ کویت یہ اعلان کر چکا ہے کہ فوجوں کی واپسی کے بعد وہ عراق کی شکایت پر بات چیت کے لیے تیار ہے۔ حتی کہ صدام حسین کے سابقہ مطالبہ کے مطابق، عالمی امن کانفرنس بلانے کا امکان بھی موجود ہے۔

ٹائم کے مطابق، خود امریکہ نے کھلے طور پر یہ وعدہ کیا تھا کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں واپس بلالیں تو صدام مخالف اتحاد اس کے بعد عراق پر حملہ نہیں کرے گا۔ مزید یہ کہ جارج بش نے اس بات کا بھی اشارہ دیا تھا کہ عراق اپنے سرحدی جھگڑوں کے بارہ میں کویت سے بات چیت کر سکے گا، اور غالباً فلسطین کے مسئلہ پر ایک انٹرنیشنل کانفرنس بھی منعقد کر سکے گا (صفحہ ۱۲) سویت یونین اور فرانس وغیرہ بھی یہ کہہ چکے تھے کہ صدام حسین اگر کویت سے اپنی فوجیں ہٹالیں تو ویسٹ ایشیا کے تمام مسائل کے مجموعی حل (package deal) کے بارہ میں اقوام متحدہ کے تحت کانفرنس کی جائے گی اور تمام مسائل کو حل کیا جائے گا۔ ٹائم نے یہ امکان ظاہر کیا تھا کہ اسرائیل پر دباؤ ڈال کر اس کو راضی کیا جائے گا کہ وہ ویسٹ بینک اور غازہ پٹی کو فلسطینیوں کے لیے خالی کر دے تاکہ وہ وہاں اپنی اسٹیٹ بنا سکیں (صفحہ ۱۴)

مگر صدام حسین نے ان تمام تجویزوں کو رد کر دیا۔ یہاں تک کہ جنگ شروع ہو گئی۔ اب مزید کچھ پانا تو درکنار، یہ یقینی ہے کہ صدام حسین کے پاس جو کچھ ہے، اس کو بھی وہ کھو دیں گے۔ اس دنیا میں بہترین عقلمندی یہ ہے کہ آدمی زیادہ کا مطالبہ کرے مگر وہ کم پر راضی ہو جائے۔ ٹکراؤ کے بغیر فریق ثانی جو کچھ دے رہا ہے، اس پر راضی ہو جانا مزید ترقی کا راستہ کھولتا ہے۔ اس کے برعکس آدمی اگر ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرے تو وہ حاصل شدہ چیز کو بھی ضائع کر دیتا ہے۔

جنگ سے پہلے صدام حسین کو جو کچھ مل رہا تھا، جنگ کے بعد وہ اس کو لینا چاہیں گے مگر اس وقت وہ کچھ بھی نہ پا سکیں گے۔ وقت گزر جانے کے بعد کوئی چیز کسی کو نہیں ملتی۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ میں امریکہ کی زیر قیادت جو "ملٹی نیشنل فورس" بنی ہے، اس میں برطانیہ بھی شامل ہے۔ برطانیہ کے فوجی پائلٹ ٹارنیڈو (Tornado) نامی جہاز کے ذریعہ عراق پر حملے کر رہے ہیں۔ کچھ برطانی پائلٹوں نے اے پی کے نمائندہ کو اپنے جنگی تجربات بتائے۔

اسکوئڈرن لیڈر مسٹر میسن (Pablo Mason) نے کہا کہ جب ہم دشمن کے اوپر بمباری کرنے کے لیے اڑتے ہیں تو دشمن کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ہر وقت یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ ہم خود کسی متوقع یا غیر متوقع حادثہ میں تباہ ہو سکتے ہیں۔ اس وقت سارا معاملہ صرف سکنڈوں کا ہوتا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جنوری ۱۹۹۱) کی رپورٹ کے مطابق، پائلٹ میسن نے کہا کہ جنگ کے حالات میں ہمارے اندر مسلسل یہ شعور موجود ہوتا ہے کہ چند منٹوں میں وہ لمحہ آسکتا ہے کہ میں دنیا میں نہ رہوں:

> There is a constant awareness that in a few seconds' time you may not exist. (p. 7)

یہ احساس یا شعور جو ایک فوجی پائلٹ کے اندر جنگی حالات کے درمیان ہوتا ہے، وہی مومن کی مستقل زندگی ہے۔ مومن موجودہ دنیا کی زندگی کو امتحان سمجھتا ہے۔ خدا اس کو دنیا میں پیدا کر کے ہر لمحہ اس کی نگرانی کر رہا ہے، جیسے ہی خدا کی طرف سے مقرر کی ہوئی مدت پوری ہو گی، فوراً موت کا فرشتہ آجائے گا تاکہ اس کی روح قبض کرے اور اس کو دنیا سے نکال کر آخرت کے عالم میں پہنچا دے۔

جس آدمی کو یہ احساس ہو کہ اگلے سکنڈ میری موت آسکتی ہے، وہ بے حد چوکنا ہو جائے گا۔ ہر لمحہ کو وہ اپنے لیے آخری لمحہ سمجھے گا۔ وہ جینے سے زیادہ مرنے کو یاد کرے گا۔ وہ آج سے زیادہ کل کی فکر کرے گا۔ وہ آخری حد تک یہ کوشش کرے گا کہ دنیا کے ذریعہ آخرت کو کمائے نہ کہ دنیا کے ذریعہ دنیا کو۔ کیوں کہ دنیا بہت جلد ختم ہونے والی ہے۔ یہ صرف آخرت ہے جو اگلے لمحہ کے بعد اس کے لیے باقی رہے گی۔

"میں اگلے لمحہ نہ رہوں گا" یہ احساس آدمی کے لیے حال کے مقابلہ میں مستقبل کو زیادہ اہم بنا دیتا ہے۔ اس کی ساری توجہ موجودہ کے مقابلہ میں آئندہ کی طرف لگ جاتی ہے۔ وہ دنیا پرستی کو چھوڑ کر آخرت پسند انسان بن جاتا ہے۔

۲۲ جنوری ۱۹۹۱

آج کی اہم ترین خبر یہ ہے کہ عراق نے کویت کے تیل کے سیکڑوں کنوؤں میں آگ لگا دی ہے جس کے نتیجہ میں وہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور فضا میں کالا دھواں چھا گیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۲ جنوری) کی پہلی سرخی یہ تھی کہ کویت کے تیل کے کنویں اڑا دیے گئے (Kuwait oilwells blown up) غالباً صدام حسین کو اب یہ یقین نہیں رہا ہے کہ وہ کویت کو اپنے قبضہ میں رکھ سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے کویت کے تیل کے کنوؤں کو برباد کرنا شروع کر دیا ہے۔ تاکہ کویت کو چھوڑنا ہو تو اس طرح چھوڑیں کہ وہاں کچھ باقی نہ رہے۔ تقریباً ۳۵ ملین گیلن تیل انھوں نے سمندر میں بہا دیا۔

صدام حسین نے حال میں عراق کے جھنڈوں پر اللہ اکبر لکھوایا تھا۔ وہ اپنی موجودہ جنگ کو اسلامی جہاد کہتے ہیں۔ ان کے اس قسم کے نعروں سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مسلمانوں کی اکثریت اس فریب میں پڑ گئی کہ واقعتہً یہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ مگر جو لوگ خدا کی نعمتوں میں آگ لگائیں وہ کبھی اسلام کے مجاہد نہیں ہو سکتے۔ خلیفہ اول نے خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد اسامہ کی سرکردگی میں شام کی طرف مہم روانہ کی تو ان کو یہ ہدایت دی کہ تم لوگ وہاں کوئی درخت نہ کاٹنا (لا تقطعوا شجراً)

جنگ میں "ایک درخت" کاٹنا بھی منع ہے۔ پھر تیل کے کنویں کو جلانا تو اس سے ہزاروں گنا زیادہ بڑی برائی ہے۔ تیل کے کنویں کو جلانے سے صرف تیل کا قدرتی ذخیرہ ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ اس سے جو دھواں نکلتا ہے وہ آس پاس کی پوری فضا کو مہلک گیس سے بھر دیتا ہے۔ تیل کا ذخیرہ کسی شخص کی ملکیت نہیں۔ وہ انسانیت کے لیے اللہ کا ایک قیمتی عطیہ ہے۔ وہ خدا کی ایک قیمتی امانت ہے۔ انسان اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے مگر وہ اس کو ضائع کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ تیل کے ذخیرہ کو قصداً برباد کرنا خدا کی امانت میں ظالمانہ تصرف کرنے کے ہم معنی ہے جو بلاشبہہ ناقابل معافی جرم ہے (تفصیل کے لیے: سائنس رپورٹر، نئی دہلی، مارچ ۱۹۹۱)

صدام حسین نے تیل کے کنوؤں میں آگ لگائی۔ تیل کو سمندر میں بہا کر نہ صرف انسانوں کے لیے بلکہ چڑیوں اور مچھلیوں تک کے لیے خطرناک مسائل پیدا کر دیے۔ اس کے باوجود مسلمان صدام حسین کو "مجاہد اسلام" کا لقب دیے ہوئے ہیں۔ جو لوگ اسلامی جہاد کا نام لیں مگر وہ اسلام کے احکام پر عمل نہ کریں، ایسے لوگوں کا کیس جہاد کا کیس نہیں بلکہ سرکشی کا کیس ہے۔ وہ سزا کے مستحق ہیں نہ کہ انعام کے مستحق۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۱

خلیج کی ہولناک جنگ جاری ہے۔ دونوں طرف سے زبردست نقصانات ہو رہے ہیں۔ انسان مارے جا رہے ہیں۔ شہر تباہ ہو رہے ہیں۔ سمندروں اور فضاؤں میں زہریلے اثرات پھیل جانے کی وجہ سے یہ حالت ہے کہ چڑیاں اور مچھلیاں تڑپ تڑپ کر مر رہی ہیں۔ اس تباہ کن جنگ پر صرف امریکہ کے زیر قیادت اتحادی فوجوں (الائیڈ فورسز) کا خرچ تقریباً ایک بلین ڈالر روزانہ ہے۔

جنگ لڑنے والے ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ وہ انسانی فلاح کے لیے جنگ لڑ رہے ہیں۔ خلیج کی موجودہ جنگ میں امریکہ کے زیر قیادت ۲۸ ملکوں کا اتحادی گروہ یہ کہتا ہے کہ وہ ایک کمزور قوم کے ساتھ ایک طاقت ور کی جارحیت کے خلاف لڑ رہا ہے۔ صدام حسین کے نزدیک اس جنگ کا مقصد ماضی کی غلطی کی اصلاح ہے یعنی کویت، جو اُن کے نزدیک عراق کا حصہ تھا، اس کو دوبارہ عراق میں شامل کیا جائے۔

۱۸۹۸ میں امریکن ۔ اسپینش جنگ چھڑی۔ اس وقت برطانیہ اور دوسرے یورپی ملکوں کے چھ سفیر واشنگٹن میں جمع ہوئے تاکہ امریکہ کے صدر میک کنلے کو جنگ سے اعراض پر آمادہ کریں۔ اس وقت دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی، اس کا خلاصہ امریکی اخبار میں اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ سفیروں نے کہا کہ ہم کو امید ہے کہ انسانیت کی خاطر آپ جنگ نہیں کریں گے۔ صدر نے جواب دیا کہ ہم کو امید ہے اگر ہم جنگ کریں تو یہ عین انسانیت کی خاطر جنگ ہوگی :

> Their ambassadors in Washington had a meeting with the US President, and the diplomatic exchanges were summarised by the New York World, of April 8, 1898, thus:
>
> Said the six ambassadors: "We hope for humanity's sake you will not go to war."
>
> Said Mr McKinley in reply: "We hope if we do go to war, you will understand that it is for humanity's sake."

پچھلے پچاس سال میں صرف "تیسری دنیا" میں تین سو چھوٹی بڑی لڑائیاں ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہر فریق اپنے آپ کو برحق بتاتا ہے۔ یہ صورت حال آخرت کو ایک لازمی اخلاقی ضرورت ثابت کر رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آخرت نہ آئے تو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ کون شخص حق پر تھا اور کون شخص ناحق پر۔

جنگ چھیڑنا اپنے اختیار میں ہے مگر جب جنگ چھڑ جائے تو اس کی تباہی اپنے اختیار میں نہیں ہوتی۔ عقلمند وہ ہے جو جنگ کی نوبت ہی آنے نہ دے۔

۲۵ جنوری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۲۵ جنوری) میں اردو پریس کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ بمبئی کے اردو روزنامہ "اردو ٹائمز" پر مسلمانوں کے ایک مشتعل ہجوم نے سنگ باری کی۔ اس کی کاپیاں سڑک پر جلائی گئیں۔ اخبار کے ملازموں کو دھمکیاں دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو ٹائمز واحد اردو پرچہ ہے جس نے خلیج کی جنگ میں صدام حسین کی مذمت کی اور سعودی حکومت کی موافقت کی پالیسی اختیار کی۔ عدم برداشت کا یہ مزاج کسی حقیقی صحافت کو وجود میں لانے کے لیے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

آج کل تمام اردو اخبارات پرجوش طور پر صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کو صلاح الدین ایوبی اور "صدام مجاہد اسلام" لکھا جا رہا ہے۔ مسلم علاقوں میں صدام حسین کی تصویریں ہاٹ کیک کی طرح بک رہی ہیں۔ جن اردو اخبارات کی اشاعت بہت کم تھی، انھوں نے صدام حسین کی حمایت میں جذباتی مضامین لکھ کر اپنی اشاعت بہت زیادہ بڑھا لی۔ مسلمانوں میں وہی اخبارات مقبول ہو رہے ہیں جن میں اِس قسم کی سرخیاں ہوں:

"عراقی مزائلوں سے اسرائیل کی نیند حرام"۔ "بُش نے صدام کے آگے گھٹنے ٹیک دیے" وغیرہ

مسلم صحافت کا اور مسلمانوں کا یہ حال دیکھ کر مجھے دوسری عالمی جنگ کا واقعہ یاد آتا ہے۔ اس زمانہ میں ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ مسلمان انگریزوں سے بے حد متنفر تھے۔ جنگ میں جب ہٹلر کی فوجوں نے برطانیہ پر بم گرائے تو مسلمان بہت خوش ہوئے۔ اخبارات میں ایک اردو شاعر کی نظم چھپ کر بہت مقبول ہوئی۔ اس کا عنوان تھا "ہٹلر اعظم"۔ اس نظم میں ہٹلر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

خبر لینے بکنگھم کی جواب کی بار پھر جانا　　ہمارے نام کا بھی ایک گولہ پھینکتے آنا

یہی جذباتیت آج مسلمانوں میں شدت سے ابھر آئی ہے۔ مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں سے سخت نفرت ہے۔ صدام حسین نے عیسائیوں (امریکہ) کے بارہ میں کہا کہ تم کو خلیج عرب میں غرق کر دیا جائے گا۔ اور اسرائیل کے اوپر کچھ اسکڈ (Scud) مزائل پھینک دیے۔ اس کے بعد مسلمان ایک طرف سے صدام حسین کی حمایت کرنے لگے۔ مگر یہ صرف سطحیت ہے۔ اس کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔

مسلمانوں کے اس مزاج نے اردو صحافت کو انتہائی حد تک سطحی بنا دیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اردو اخبارات پڑھنے والا آدمی عالمی حقیقتوں سے اتنا ہی بے خبر رہتا ہے جتنا غالب اور ذوق کا دیوان پڑھنے والا آدمی سائنسی علوم سے۔

۲۶ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۲۶ جنوری) میں صدام حسین کے اس محل کی تفصیل چھپی ہے جو انھوں نے بغداد میں بنوایا ہے۔ اس کی سرخی یہ ہے ـــــ صدام اپنے اس محل کے تہ خانہ میں ایک سال تک رہ سکتے ہیں :

Saddam can live 1 year in his bunker

اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بغداد کا یہ صدارتی محل ۱۲۰ فٹ گہرا ہے اور پورا لوہے اور سمنٹ پر بنایا گیا ہے۔ وہ مکمل طور پر ایر کنڈیشنڈ ہے۔ اس میں نیچے سے اوپر تک لفٹ کا انتظام ہے۔ صدام حسین اس میں ایک سال تک ایٹمی حملہ سے محفوظ حالت میں رہ سکتے ہیں۔ اس میں ایک زمین دوز ذخیرۂ آب سے پانی پہنچایا جاتا ہے جو محل سے ۴۰۰ میٹر فاصلہ پر واقع ہے۔ وغیرہ

ایک فرنچ انجینئر جس نے اس محل کو بنانے میں مدد دی تھی، اس نے کہا کہ جب آپ لفٹ کے ذریعہ اس زمین دوز محل میں اتریں تو آپ ایک نہایت موٹے دروازہ سے گزر کر صدام حسین کے دفتر میں پہنچیں گے۔ صدام حسین کی اندرونی رہائش گاہ تک پہنچنے کے لیے کئی ایسے چیمبر سے گزرنا ہوتا ہے جو صرف کوڈ کے ذریعہ کھلتے ہیں۔ اس کے لیے میگنیٹک کارڈ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کے اور بہت سے خفیہ حفاظتی انتظامات ہیں جن کی تفصیل ڈیلی ٹیلی گراف نے چھاپی ہے۔

اس محل کے اندر ہر قسم کے تمام ضروری سامان کیے گئے ہیں۔ اس کے اندر ایسا کمیونی کیشن نظام ہے کہ صدام حسین اس کے اندر رہتے ہوئے تمام ملک سے اور پوری افواج سے مسلسل ربط قائم رکھ سکتے ہیں۔ وہ یہیں سے اپنی قوم کے نام ٹی وی پروگرام نشر کرتے ہیں۔ صدام حسین کوئی چیز اس وقت تک نہیں کھاتے جب تک کوئی دوسرا شخص ان کے سامنے اس کو چکھ نہ لے۔ فرانسیسی انجینیر نے کہا کہ صدام حسین اس زمین دوز محل میں لمبی مدت تک رہ سکتے ہیں اور یہاں سے جنگ کی رہنمائی کر سکتے ہیں :

Saddam Hussein could survive and function from this emplacement for a long time.

اس قسم کا زمین دوز محل بنا کر "ام المحارب" میں فتح کا خواب دیکھنا صرف صدام حسین کی کم عقلی کا ثبوت ہے۔ یہ "کلھیا میں گڑ پکانا" ہے۔ اور جو شخص کلھیا میں گڑ پکائے اس کا گڑ اس عالم اسباب میں کبھی تیار نہیں ہوتا۔

۲۷ جنوری ۱۹۹۱

مکہ متفقہ طور پر مسلمانوں کا سب سے زیادہ مقدس مقام ہے۔ خلیج کا مسئلہ پیدا ہونے کے بعد ۲۳-۲۵ جمادی الآخرۃ ۱۴۱۱ھ (۹-۱۱ جنوری ۱۹۹۱) کو مکہ میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس میں سعودی عرب کے اور تمام دنیا کے علماء جمع ہوئے۔ تین دن کے غور و بحث اور مشورہ کے بعد "اعلان مکۃ المکرمۃ الی الامۃ الاسلامیۃ" جاری ہوا۔ میرے سامنے اس کا وہ مستند متن ہے جو ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۷ جنوری ۱۹۹۱ء) میں سات صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس رو داد کا عنوان یہ ہے ــــــ عراقی فوج کے نام پیغام، صدام کی نافرمانی شرعی طور پر واجب ہے (رسالۃ الی الجیش العراقی، عصیان صدام واجب شرعی)

رپورٹ کے مطابق، علماء کی موتمر نے متفقہ طور پر صدام کے خلاف یہ پکار بلند کی کہ تم فوراً کویت سے نکل جاؤ (اخرج یا صدام حسین من الکویت - اخرج الآن ولیس غدا) اس میں کہا گیا ہے کہ عراقی فوج پر لازم ہے کہ وہ ظالم صدام کی اس کے ظلم میں حمایت نہ کرے (الواجب علی جیش العراق الایطیع الظالم فی ظلمہ) علماء اسلام کی اس عالمی کانفرنس نے متفقہ طور پر ساری دنیا کے مسلمانوں کو پکارا کہ وہ صدام حسین کا ساتھ نہ دیں، وہ خلیج میں صدام حسین کے اقدام کی مذمت کریں جس کے نتیجہ میں امریکہ اور مغربی طاقتوں کو خلیج میں آنے کا موقع ملا۔ اسی طرح دہلی میں بھی ہندستانی علماء کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں بھی وہی باتیں کہی گئیں جو مکہ کی کانفرنس میں کہی گئی تھیں۔

اصولاً میں علماء کی اس پکار سے متفق ہوں۔ مگر عجیب بات ہے کہ اس پکار کے باوجود یہ ہوا کہ تقریباً ساری دنیا کے مسلمان صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ کسی بھی ملک کے مسلمانوں نے ان اعلانات اور ان اپیلوں کی پروا نہیں کی۔ عراق کی فوج کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ صدام حسین کا ساتھ دینے کے لیے مجبور تھی۔ مگر مسلم عوام تو آزادانہ طور پر خود اپنے فیصلہ کے تحت صدام حسین کے حامی بنے ہوئے ہیں۔ مسلم علماء اور مسلم عوام کے درمیان علٰحدگی کی اتنی بڑی مثال تاریخ میں کوئی اور نہیں ملتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خود مسلم علماء اور مسلم رہنماؤں نے ان قوموں کے خلاف مسلم عوام کو اتنا متنفر کر رکھا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اب اس معاملہ میں غیر جذباتی رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ "نفرتِ مغرب" کی جو نفسیات مسلمانوں میں پیدا کی گئی ہے، اس کا نتیجہ وہی نکل سکتا تھا جو نکلا۔

۲۸ جنوری ۱۹۹۱

عراقی لیڈر کی بلند بانگ تقریریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ عرب کے صحرا کو امریکیوں اور اتحادیوں کا قبرستان بنادیا جائے گا۔ اس طرح کی باتیں مسلمانوں کو مجاہدانہ معلوم ہوتی ہیں۔ دوسری طرف سعودی عرب کے شاہ فہد کی بات مسلمانوں کو کمتر محسوس ہوتی ہے، کیونکہ انھوں نے امریکہ اور اس کے حلیفوں سے اتحاد کرلیا ہے۔ آج ایک صاحب نے بتایا کہ جامع مسجد کے علاقہ میں دیواروں پر ایسے پوسٹر لگائے گئے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے: سعودی اور یہودی ایک سکہ کے دو رخ۔ ایک مسجد میں نماز ختم ہوئی تو ایک مسلمان نے ہاتھ اٹھا کر کہا: خدایا، سعود اور یہود کو ہلاک کردے۔

خلیج کی نزاع میں کون حق پر ہے اور کون ناحق پر، اس کو سمجھنے کے لیے احادیث کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس معاملہ میں سعودی عرب حق پر ہے اور دوسرا گروہ ناحق پر۔

امام الترمذی نے عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس میں یہ قرینہ ملتا ہے کہ آخر زمانہ میں حق جزیرۂ عرب کی طرف ہوگا۔ اس روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین حجاز میں پناہ لے گا جس طرح سانپ اپنی بل میں پناہ لیتا ہے (إن الدين ليأرِز إلى الحجاز كما تأرِز الحيّةُ إلى جُحرها) جامع الاصول فی احادیث الرسول، ۹/ ۲۴۱

دوسری روایت میں موجودہ حالات کے بارہ میں براہ راست اشارہ ملتا ہے۔ امام ابوداؤد نے "کتاب الملاحم" میں نقل کیا ہے کہ ذومخبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ تم آئندہ روم (عیسائیوں) سے پُرامن صلح کروگے۔ پھر تم اور وہ دونوں ایک اور دشمن سے لڑوگے۔ پھر تم لوگوں کو فتح ہوگی۔ تم غنیمت حاصل کروگے اور سلامت رہوگے۔ پھر تم لوگ واپس ہوگے، یہاں تک کہ تم ایک چراگاہ میں ٹھہروگے جہاں ٹیلے ہوں گے۔ اس وقت عیسائیوں میں سے ایک شخص صلیب اٹھائے گا اور کہے گا کہ صلیب غالب آئی۔ پھر مسلمانوں میں سے ایک شخص کو غصہ آئے گا، وہ صلیب کو توڑ دے گا۔ اس وقت روم (عیسائی) عہد کو توڑ دیں گے اور جنگ کے لیے جمع ہو جائیں گے (سنن ابی داؤد، ۴/ ۱۰۹)

ان احادیث کی موجودگی میں مسلمانوں کی موجودہ روش یقینی طور پر درست نہیں۔ یہ صرف خواہش پرستی ہے نہ کہ قرآن وسنت کی پیروی۔

۲۹ جنوری ۱۹۹۱

انڈیا کے ایک انگریزی جرنلسٹ مسٹر ایس نہال سنگھ خلیجی جنگ کے زمانہ میں بغداد میں تھے۔ انھوں نے اپنے کچھ تجربات ہندستان ٹائمس (۲۹ جنوری) میں شائع کیے ہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ وہ کچھ اور صحافیوں کے ساتھ بغداد کے ممتاز ہوٹل الرشید میں مقیم تھے۔ مگر اس کا حال یہ تھا کہ کسی بھی بل کی ادائگی کے لیے صرف امریکی ڈالر ہی واحد قابل قبول سکہ تھا۔ یہاں امریکہ انتہائی نفرت کی علامت تھا، مگر عملاً امریکی ڈالر ہی بغداد پر حکومت کر رہا تھا:

'Much as the United States was the hated symbol of Western might, the dollar ruled Baghdad.

یہ واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ آج امریکہ اور ترقی یافتہ مغربی ممالک نے کس طرح تمام ذرائع پر قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ امریکہ جائیے تو آپ دیکھیں گے کہ جو مسلمان امریکہ سے نفرت کرتے ہیں، وہی اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے امریکہ کو اپنا وطن بنائے ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں کرنے کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مسلم دنیا کو جدید سائنسی میدانوں میں ترقی یافتہ بنایا جائے۔ مگر اس رخ پر کسی بھی مسلم ملک میں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلم ملکوں کو پٹرول کا خزانہ دے کر وہ اقتصادی طاقت دے دی تھی جس کے ذریعہ مسلم دنیا اپنے ترقیاتی منصوبوں کو مکمل کر سکے۔ مگر اس قدرتی خزانہ کو کچھ ممالک عیش وعشرت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اور کچھ ممالک یہ کر رہے ہیں کہ مغربی ملکوں سے خطرناک ہتھیار خرید کر خود مسلم ملکوں کے خلاف جارحانہ کارروائی کریں جس کی بدترین مثال وہ ہے جو عراق نے پیش کی ہے۔

صدام حسین کو پٹرول کی صورت میں مفت کی دولت مل گئی۔ اس دولت کو انھوں نے عراق کی ترقی میں نہیں لگایا۔ انھوں نے یہ کیا کہ روس، جرمنی، فرانس وغیرہ سے مہلک ہتھیار خرید کر پڑوسی ملکوں کو چیلنج کرنے لگے۔ اس کے برعکس اگر وہ اس قدرتی دولت کو ملک کی ترقی میں لگاتے تو عین ممکن تھا کہ عراق سکہ بھی وہی اقتصادی اہمیت حاصل کر لے جو آج امریکی ڈالر کو حاصل ہے۔

مسلمانوں کی بربادی کا سبب ان کی یہی داخلی کمزوری ہے نہ کہ کوئی بیرونی سازش۔ جو لوگ بیرونی سازشوں کی خبریں چھاپتے ہیں وہ صرف اپنی بے خبری کا ثبوت دے رہے ہیں۔

۳۰ جنوری ۱۹۹۱

لندن کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ لندن کے تمام مسلمان خلیج کے موجودہ بحران میں صدام حسین کے حامی ہیں۔ صرف وہ تھوڑے سے مسلمان جن کو سعودی عرب سے پیسہ ملتا ہے، وہ سعودی عرب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو کوئی دلیل نہیں۔ اس بات کو الٹ کر اگر میں یہ کہوں کہ جو لوگ صدام حسین کے حامی ہیں ان کو عراق کی حکومت نے پیسہ دے رکھا ہے تو آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

میں نے کہا کہ صدام حسین کو اگر حملہ کرنا تھا تو انھوں نے اسرائیل پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کویت پر کیوں حملہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں لندن میں عراق کے سفیر سے ملا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کویت پر کیوں حملہ کیا۔ سفیر نے کہا کہ اصل میں تو ہم اسرائیل پر حملہ کرنا چاہتے تھے، ہم نے سعودی عرب اور کویت سے کہا کہ اس معاملہ میں ہمارا ساتھ دو، مگر وہ ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے ہم کو ایسا کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ آپ کو سفیر عراق سے پوچھنا چاہیے تھا کہ جب آپ نے سعودی عرب اور کویت کی حمایت کے بغیر ایران اور کویت پر حملہ کر دیا تو اسی طرح آپ ان کی حمایت کے بغیر اسرائیل پر بھی حملہ کر سکتے تھے۔

پھر انھوں نے کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ عراقی سفیر کے بیان کے مطابق، عراق کو یہ خطرہ تھا کہ جب وہ اسرائیل پر حملہ کرے گا تو امریکہ کی فوجیں خلیج میں عراق کے خلاف آجائیں گی۔ میں نے کہا کہ آپ کو عراقی سفیر سے دوبارہ کہنا چاہیے تھا کہ امریکی فوج تو کویت پر حملہ کی صورت میں بھی مکمل طور پر خلیج میں آگئی ہے۔ پھر جس طرح کویت پر حملہ کے وقت آپ نے امریکی فوج کی آمد کی پروا نہیں کی، اسی طرح آپ اسرائیل پر حملہ کے وقت بھی امریکی فوج کی آمد سے بے پروا ہو کر اسرائیل کے خلاف اپنی فوجی کارروائی کر سکتے تھے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ کتنی زیادہ سطحی ہوگئی ہے اور مسلمانوں کے لیڈر کس طرح مسلمانوں کی کم فہمی کا استغلال کر رہے ہیں۔

انسان کا حال یہ ہے کہ وہ ذاتی محرک کے تحت ایک اقدام کرتا ہے اور پھر اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اصول کی زبان بولتا ہے۔ وہ اپنی قیادت قائم کرنے کے لیے ہنگامے کھڑے کرتا ہے اور اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا عنوان دیتا ہے۔ وہ قومی خواہش اور مادی مفاد کے تحت عمل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ حق کی خاطر ایسا کر رہا ہے۔ ایسے لوگ سرکشی کی حد تک مجرم ہیں خواہ اپنی تبریہ کے لیے وہ کتنے ہی خوب صورت الفاظ بولتے رہیں۔

۳۱ جنوری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۳۱ جنوری) میں نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــــ مسلمانوں کو مغرب کی طرف سے غضب ناک ردعمل کا اندیشہ :

Muslims fear backlash

اس رپورٹ میں دوسرے حوالوں کے ساتھ مسٹر کلیم خواجہ کا بیان نقل کیا گیا ہے۔ وہ امریکہ کی ایسوسی ایشن آف انڈین مسلمس کے پریسیڈنٹ ہیں۔ امریکہ میں اس وقت ایک لاکھ (100,000) ہندستانی مسلمان رہتے ہیں۔ تاہم جو مسئلہ پیدا ہوا ہے وہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے بارہ میں ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ خلیج کی جنگ اور اس معاملہ میں مسلمانوں کے عام رویہ نے مغرب کی مسیحی قوموں میں ان کے خلاف سخت نفرت اور غصہ پیدا کر دیا ہے۔ وہ اس صورت حال کا شکار ہو رہے ہیں جس کو مسٹر خواجہ نے نسلی غضب ناکی (racist backlash) کا نام دیا ہے۔ مغربی ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کو نہ صرف تحقیر کا تجربہ ہو رہا ہے بلکہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات بھی ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پرجوش مظاہروں نے خلیج کی جنگ کو اسلام اور عیسائیت کی جنگ بنا دیا ہے۔ اس نے غیر ضروری طور پر لوگوں میں صلیبی دور کی یادیں تازہ کر دی ہیں۔

مسٹر کلیم خواجہ نے اپنے بیان میں کہا کہ انھیں یہ پریشانی بھی ہے کہ خلیج کی جنگ سے پیدا شدہ اس صورت حال کا اثر جنوب ایشیائی ملکوں (مسلم ممالک) کی اقتصادیات پر بھی پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا ایک فوری اثر یہ متوقع ہے کہ تیسری دنیا کے ملکوں کی طرف ٹکنالوجی کی آمد رک جائے گی۔ یہ ان ملکوں کے لیے ترقی میں رکاوٹ کے ہم معنی ثابت ہوگا :

> One immediate effect that can be expected, will be a halt of the supply of technology to third world countries. That will prove to be a major set-back. (p. 14)

امریکہ کے مسلم لیڈر کو موجودہ حالات کا یہ خطرناک نتیجہ نظر آتا ہے کہ مغربی ملکوں سے مسلم ملکوں کی طرف ٹکنالوجی کے آنے میں رکاوٹ پڑے گی۔ مگر میری نظر میں اس سے بڑا خطرہ دعوتی ہے۔ خلیج کی جنگ میں مسلمانوں کے پرجوش رویہ نے مسلمانوں اور مغرب کی مسیحی قوموں کے درمیان جو نفرت پیدا کی ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ ان قوموں کے اندر اسلام کی اشاعت کا عمل رک جائے گا۔ یا کم از کم اس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔

یکم فروری ۱۹۹۱

ایک صاحب ایک اردو ماہنامہ لے کر آئے اور کہا کہ اس کے شذرات کو پڑھئے۔ اس میں لکھا ہوا تھا:

"امریکہ کے سخت رویہ اور مسلمانوں کو کچل دینے کی پالیسی نے عرب کی سرزمین کو اس وقت میدان کارزار میں تبدیل کر دیا ہے جہاں مانند آب مسلمان کا لہو ارزاں ہو گیا ہے اور تثلیث کے فرزند کھلم کھلا میراث خلیل میں در اندازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ نبی آخر الزماں کا ارشاد ہے کہ اخرجوا الیھود والنصاری من جزیرۃ العرب (جزیرۂ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دو) اور قرآن مجید میں ان سے عدم موالات کا حکم دیا گیا ہے (لا تتخذوا الیھود والنصاری اولیاء) مگر آپ کے پیروؤں اور خالص وارثوں نے ان کو اپنا حلیف بنا لیا ہے۔ اور اب ان کا لشکر جزیرۃ العرب میں دندناتا پھر رہا ہے۔ اور مسلمانوں کے اہم اور مرکزی شہر ناگاساکی اور ہیروشیما بنتے جا رہے ہیں۔" (معارف فروری ۱۹۹۱)

میں نے انھیں عربی ہفت روزہ الدعوۃ کے شمارے (۳۱ جنوری، ۲۱ فروری ۱۹۹۱) دکھائے۔ ان میں الشیخ ابن باز نے اضطرار کے اسلامی اصول کے تحت غیر مسلم حکومتوں سے تعاون لینے کو جائز قرار دیا ہے۔ ان مضامین کو دیکھ کر وہ بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا کہ جو مولوی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں وہ سب سعودیہ کے نمک خوار ہیں، وہ امریکہ کے ایجنٹ ہیں۔

یہی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں، خاص طور پر ان کے "لکھنے اور بولنے والے طبقہ" کا عام انداز ہے۔ یہ لوگ اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اختلاف رائے پیش آتے ہی وہ طنز و تعریض اور عیب جوئی اور الزام تراشی کا انداز اختیار کر لیتے ہیں وہ تنقید کا جواب صرف تعییب سے دینا جانتے ہیں۔

اسلام میں صرف یہود و نصاریٰ کے جغرافی اخراج کا حکم نہیں ہے۔ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ نفسیاتی امراض کے قلبی اخراج کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ دوسرے مسلمان سے بغض نہ رکھے۔ وہ انانیت میں مبتلا نہ ہو۔ وہ بے انصافی نہ کرے، وہ دوسرے کا بدخواہ نہ بنے۔ وہ انتقامی جذبہ کو اپنے دل سے نکال ڈالے۔ وہ کسی کی کردار کشی نہ کرے۔ کسی کی نیت پر حملہ نہ کرے۔ وہ کسی کی طرف غلط بات منسوب نہ کرے۔ وہ کسی کی بربادی کے درپے نہ ہو۔

مگر اس دوسرے "اخراج" سے کسی کو کوئی دل چسپی نہیں۔ جغرافی اخراج کے چیمپین قلبی اخراج کے معاملہ میں بے حقیقت ثابت ہو رہے ہیں۔

۲ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۲ فروری) میں مسٹر شام لال کا ایک آرٹیکل چھپا ہے۔ خود آرٹیکل میں تو کوئی گہری بات نہیں، البتہ اس کا عنوان مجھے پسند آیا جو ان الفاظ میں ہے ــــــ لڑائی جیتو اور امن ہار دو :

Win the War; Lose the Peace

خلیج کی جنگ میں پچھلے دو ہفتہ کے اندر تقریباً پچاس بلین ڈالر کا نقصان ہو چکا ہے۔ یہ نقصان مزید بڑھتا رہے گا۔ جنگ میں خواہ جو فریق جیتے، جہاں تک امن کا تعلق ہے، وہ بہر حال کھویا جا چکا ہوگا۔ بنگلہ دیش کی جنگ (۱۹۷۱) میں انڈیا جیت گیا۔ مگر اس کے بعد ملک میں تشدد اور مہنگائی اور کرپشن کا جو طوفان آیا اس نے امن اور سکون کو ہمیشہ کے لیے غارت کر دیا۔

یہی حال خلیج کی جنگ کے بعد بھی زیادہ بڑے پیمانے پر ہونے والا ہے۔ اس جنگ میں فتح کا تمغہ جس فریق کو بھی ملے، عام انسان کی مصیبتوں میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔ اور یہ مصیبتیں عالمی ہوں گی، حتی کہ اس کا برا اثر اس ملک تک بھی پہنچ جائے گا جس نے جنگ کے بعد فتح کا تمغہ حاصل کیا ہے۔

جنگ خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، وہ مسائل کے حل کے نام پر لڑی جاتی ہے، مگر ہر جنگ صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ ایک مغربی مفکر نے بالکل صحیح کہا کہ مسائل ہمیشہ وہ لوگ پیدا کرتے ہیں جو مسائل حل کرنے کے لیے سرگرم ہوتے ہیں :

Problems are created by problem-solving activity.

جنگوں کی تاریخ میں معلوم طور پر ایک ہی استثنائی نمونہ ہے، اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ پیغمبر اسلام کا دوسروں سے ٹکراؤ پیش آیا۔ مگر آپ نے جنگ کا طریقہ اتنا کم استعمال کیا کہ عملاً اور مقابلۃً وہ جنگ نہ کرنے کے برابر ہے۔ اس کے باوجود آپ نے انسانی مسائل کو اتنے کامیاب طور پر حل کیا کہ تاریخ میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

پیغمبر اسلام کے ساتھ وہ تمام احوال پیش آئے جن کے نام پر جنگ کی جاتی ہے۔ مگر آپ نے جنگ کے بجائے امن کی طاقت سے ان کا مقابلہ کیا۔ مسلمان اگر اپنے پیغمبر کی اس سنت کو زندہ کریں، وہ دنیا کو دوبارہ دکھائیں کہ امن کی طاقت کس طرح سب سے بڑی طاقت ہے تو وہ نہ صرف خود اپنی جنگ لڑائی کے بغیر جیت لیں گے، بلکہ اس ربانی طریقہ کا مظاہرہ کر کے وہ قوموں کے امام بن جائیں گے۔

۳ فروری ۱۹۹۱

آج کل اخبارات کا پہلا صفحہ خلیج کی جنگ کی خبروں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مزید خصوصی صفحات صرف اسی جنگ کے بارہ میں ہوتے ہیں جن کے اوپر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے: خلیجی جنگ (The Gulf War) ہندستان ٹائمس (۳ فروری) کا صفحہ ۱۴ اسی قسم کا ایک صفحہ ہے۔ اس میں حسب معمول خلیج کی جنگ سے متعلق خبریں شائع ہوئی ہیں۔

جنگ کی ہلاکت کی خبروں کے درمیان ایک بلا عنوان خبر چار سطروں میں ہے۔ وہ یہ ہے —— ایک شخص جس پر الزام تھا کہ اس نے ۱۹۸۸ سے اب تک نیویارک کے راشسٹر علاقہ کی ۱۰ عورتوں کو قتل کیا ہے، اس کو عدالت نے ۲۵۰ سال قید کی سزا دی ہے جو امریکی قانون میں ایسے مجرم کی کم سے کم سزا ہے:

A man convicted of killing ten Rochester area women in New York since 1988 has been sentenced to a minimum of 250 years in prison.

اخباری ترتیب میں بظاہر یہ سب سے چھوٹی خبر ہے۔ شاید ہی کسی پڑھنے والے نے اس خبر کو پڑھا ہو۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بلا شبہ سب سے بڑی خبر ہے۔ مہلک جرائم کی سزا جو ملکی قوانین میں مقرر کی گئی ہے، وہ گویا انسانی ضمیر کی آواز ہے۔ یہ سزائیں دراصل انسانی ضمیر کا قانونی اظہار ہیں۔

انسانی ضمیر یہ چاہتا ہے کہ قتل کرنے والے کو قتل کیا جائے۔ یا کم از کم لمبی مدت تک کے لیے اس کو پُرمشقت قید خانہ میں ڈال دیا جائے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی ضمیر کے مطابق، ان لوگوں کی سزا کتنی زیادہ سخت ہونی چاہیے جو ایسی جنگ برپا کرتے ہیں جس میں لاکھوں افراد ہلاک ہوں۔ کروروں انسان زخمی اور اپاہج ہو جائیں۔ زندگی کے قیمتی وسائل بے حساب مقدار میں برباد ہوں۔ خشکی اور سمندر اور فضا سب فساد سے بھر جائیں۔ جن قدرتی ذرائع کو خدا نے انسانیت کی تعمیر کے لیے پیدا کیا ہے، ان کو انسانیت کی تخریب میں ضائع کر دیا جائے۔ مذکورہ قاتل مزید ۲۵۰ سال تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ گویا انسانی عدالت ایک انفرادی مجرم کو بھی سزا دینے کی طاقت نہیں رکھتی۔ پھر جو لوگ ساری انسانی نسل پر ہلاکت کا عذاب انڈیل دیں، ان کو سزا دینا کس کے اختیار میں ہے۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ موجودہ محدود دنیا کے بجائے ایک اور لامحدود دنیا ظہور میں آئے۔ لامحدود دنیا میں قائم ہونے والی عدالت ہی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے سرکش انسانوں کو بھرپور سزا دے سکے۔

۴ فروری ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ ۱۷ جنوری کو شروع ہوئی۔ اس وقت سے رات دن مسلسل بم باری کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر دو ہفتہ تک سارا معاملہ تقریباً ایک طرفہ رہا۔ اتحادی جہاز عراق کے اوپر آگ برساتے رہے اور صدام حسین اور ان کی فوج زمین دوز بنکروں کے نیچے بیٹھی رہی۔

۳۰ جنوری کو اس میں تبدیلی آئی۔ عراق کی زمینی فوج نے اچانک پیش قدمی کرکے سعودی عرب کی سرحدی بستی الخفجی پر قبضہ کر لیا۔ اس کے فوراً بعد اتحادیوں کی زمینی اور ہوائی فوج متحرک ہوئی۔ دو دن تک "گھمسان کی لڑائی" کی خبریں آتی رہیں۔ آخر عراقی فوج کو بری طرح شکست ہوئی۔ بڑی تعداد میں عراقی ہلاک ہوئے۔ کچھ گرفتار ہوئے اور کچھ اپنا سامان چھوڑ کر بھاگے۔

جنگ کے ایک ماہر نے کہا ہے کہ الخفجی کی جنگ عراقیوں کے لیے الٹی پڑے گی۔ اس سے پہلے امریکہ اور اس کے ساتھی عراق کی زمینی فوج سے ڈرتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ زمینی جنگ میں عراق کو زیر کرنا بہت مشکل ہوگا۔ مگر الخفجی کے تجربہ نے انھیں عراقی فوج کی کمزوریوں (weaknesses) کو بتا دیا۔ اس جزئی جنگ میں اتحادیوں نے پایا کہ عراقی فوج کا کمیونی کیشن کا نظام بہت کمزور تھا۔ اسی طرح عراقی فوجیوں میں مہارت (skill) کی بھی بہت کمی نظر آئی۔ مزید یہ کہ انھوں نے محسوس کیا کہ عراقی فوجی دل سے لڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ عراقی فوجی لڑائی میں اتنے سخت نہیں تھے جتنا کہ خیال تھا کہ وہ ہوں گے :

...they were not as tough as we thought they might be

تازہ رپورٹ کے مطابق، الخفجی کے بعد امریکی فوج کے حوصلے بہت بلند ہو گئے ہیں اور اب وہ منصوبہ بنا رہے ہیں کہ پوری طاقت کے ساتھ کویت اور عراق پر حملہ کرکے کم سے کم مدت میں عراقی فوج کو تباہ کر دیں۔

الخفجی کے واقعہ نے عراقی فوج کا بھرم ختم کر دیا۔ اب تقریباً یقینی نظر آرہا ہے کہ عراقی فوج امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا مقابلہ زمینی جنگ میں نہیں کر پائے گی اور رسواکن شکست سے دوچار ہوگی۔

خواہ دو آدمیوں کا معاملہ ہو یا دو قوموں کا معاملہ، دھاگ کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ آدمی اگر لڑکر جیتنے والا نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ خاموش بیٹھا رہے۔ نہ لڑنے سے کم از کم یہ ہوتا ہے کہ وہ فریق ثانی کے اوپر اپنی دھاگ قائم رکھتا ہے، جب کہ جنگ چھیڑنے کی صورت میں وہ جنگ بھی ہار جاتا ہے اور اسی کے ساتھ دشمن کی نظر میں وہ اپنی دھاگ بھی کھو دیتا ہے۔

۵ فروری ۱۹۹۱

ریاض کے مشہور عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲۲ رجب ۱۴۱۱ھ) میں خلیج کی جنگ کے بارہ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الحماقۃ سلاح ایضا (بیوقوفی بھی ایک ہتھیار ہے)

اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مغرب کے فوجی افسروں میں سے ایک سے پوچھا گیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار کیا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اتحادی طاقتوں کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار صدام حسین کی بے وقوفی اور اس کا طیش اور جنون ہے۔ اور انھیں چاہیے کہ وہ اس ہتھیار سے فائدہ اٹھائیں تاکہ وہ جلد فتح حاصل کر سکیں:

سُئل احد القادة العسكريين الغربيين عن ابرز الاسلحة واشدها فتكا في يد القوات الدولية المتحالفة۔ فقال ان ابرز سلاح في ايدي القوات المتحالفة هو غباء صدام وطيشه وجنونه وان عليهم ان يستثمروا هذا السلاح ليتمكنوا من تحقيق نصر سريع (صفحہ ۱۰)

اس پر میں یہ اضافہ کروں گا کہ کوئی بھی شخص بے وقوف نہیں ہوتا۔ مشہور قول کے مطابق، کسی چیز کے لیے بڑھی ہوئی محبت آدمی کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے (حبك الشيء يُعمي ويُصم) صدام حسین کی اصل کمزوری ان کا جنون عظمت ہے۔ اپنے آپ کو بڑا دیکھنے کے شوق نے ان کو مجنون بنا دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ایسے اقدامات کر ڈالتے ہیں جو ان کی واقعی طاقت سے باہر ہوتے ہیں۔

۱۹۷۹ میں عراق کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد وہ مسلسل اسی قسم کی احمقانہ کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۰ میں انھوں نے الجزائر معاہدہ (۱۹۷۵) کو یک طرفہ طور پر منسوخ کر کے ایران پر حملہ کر دیا اور آٹھ سال تک بے فائدہ اس سے لڑتے رہے۔ اسی طرح ۲ اگست ۱۹۹۰ کو انھوں نے اچانک کویت پر حملہ کر کے اپنے آپ کو اتنی بڑی مشکل میں پھنسا لیا جس سے نپٹنے کی طاقت ان کے اندر نہیں۔

ایمان آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے، اور جس آدمی کے اندر تواضع کی صفت پیدا ہو جائے وہ ہر قسم کی حماقتوں سے بچ جائے گا۔ وہ ایسی طاقت بن جائے گا کہ بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کو زیر نہ کر سکے۔

حماقت اکثر حالات میں اپنے آپ کو بڑا سمجھ لینے کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ ایمان آدمی کو بڑائی کے جذبہ سے بچا لیتا ہے، اس لیے ایمان آدمی کو احمقانہ کارروائی سے بھی بچا لیتا ہے۔

۶ فروری ۱۹۹۱

مزائل (missile) سب سے پہلے جرمنوں نے دوسری عالمی جنگ میں استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد روس اور امریکہ وغیرہ نے اس کو مزید ترقی دے کر خطرناک قسم کے دور مار ہتھیار کی حیثیت دے دی۔ یہ ایک پیچیدہ مشین ہے جس کے سرے پر دھماکہ خیز چیزیں نصب ہوتی ہیں۔ اس کو لانچر کے ذریعہ دور کے نشانہ پر پھینکا جاتا ہے۔ اس کی رفتار ریڈیو کی لہروں کے ذریعہ کنٹرول ہوتی ہے۔ وہ نہایت تیز پٹاخہ کی طرح فضا میں اڑتے ہوئے مطلوبہ نشانہ پر جاکر گرتا ہے۔

جرمن ٹکنالوجی کو مزید ترقی دے کر روسیوں نے ایک خطرناک مزائل بنایا جس کو اسکڈ (Scud) کہا جاتا ہے۔ یہ اسکڈ مزائل عراق نے بڑی تعداد میں سوویت روس سے خرید کر حاصل کیے اور ان کو مزید ترقی دے کر اس قابل بنایا کہ ان کو دور کے نشانوں پر مارا جا سکے۔

عراق کے صدر صدام حسین کو اپنے اسکڈ مزائل پر بہت اعتماد تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اسکڈ کی صورت میں ان کے پاس ایسا ہتھیار ہے کہ وہ حیران کن طور پر اپنے دشمنوں پر ضرب لگا سکتے ہیں۔ خلیج کی جنگ کے دوران انھوں نے ان کو مسلسل استعمال کیا۔ تقریباً ڈیڑھ درجن اسکڈ مزائل انھوں نے اسرائیل کے شہروں (حیفہ اور تل ابیب) پر پھینکے۔ اتنے ہی اسکڈ انھوں نے سعودی عرب (ظہران اور ریاض) نیز بحرین پر پھینکے۔ مگر عملاً ان کے اسکڈ مزائل غیر موثر ہو کر رہ گئے۔ کیوں کہ امریکی "پیٹریٹ" نے ان کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے مار کر گرا دیا۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ روس نے جب اسکڈ مزائل بنائے تو امریکہ نے بھی ریسرچ شروع کر دی کہ اس کا توڑ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ امریکہ نے ایک جوابی مزائل تیار کیا جس کو پیٹریٹ مزائل کہا جاتا ہے۔ پیٹریٹ

مزائل میں یہ صلاحیت تھی کہ جس وقت اسکڈ اپنے لانچر سے نکل کر روانہ ہو، عین اسی وقت پیٹریٹ بھی اڑ کر تیزی سے اس کی طرف روانہ ہو، اور اسکڈ سے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو ناکارہ کر دے۔ چنانچہ خلیج کی جنگ کے دوران عراق نے کئی درجن اسکڈ مزائل استعمال کیے۔ مگر امریکی پیٹریٹ ہر بار فضا میں پہنچ کر درمیان ہی میں اس سے ٹکرا گیا اور نشانہ پر پہنچنے سے پہلے اس کو ناکارہ بنا دیا۔

نیچے کی تصویر میں دونوں مزائلوں کو عمل کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک طرف عراق سے اسکڈ مزائل روانہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف عین اسی وقت اسرائیل کے امریکی فوجی اڈہ سے پیٹریٹ مزائل اڑتا ہے اور وہ راستہ میں اسکڈ مزائل سے ٹکرا کر درمیان ہی میں اس کو برباد کر دیتا ہے۔

پیٹریٹ مزائل کے اس عمل میں مصنوعی سیارہ سے لے کر زمینی کنٹرول اسٹیشن تک نہایت پیچیدہ نظام شامل رہتا ہے۔ تاہم پیٹریٹ کی کامیابی کا خاص راز اسکڈ مزائل کی ایک کمزوری ہے۔ اسکڈ کی خود اپنی ایک کمزوری نے امریکہ کو موقع دیا کہ وہ اس کا کامیاب توڑ تیار کر سکے۔

اسکڈ جب تیزی کے ساتھ فضا میں گزرتا ہے تو وہ نہایت سخت قسم کی گرمی پیدا کرتا ہے۔ یہ گرمی اسکڈ کی کمزوری ہے۔ پیٹریٹ فضا میں اٹھ کر اسی گرمی کا پیچھا کرتا ہے۔ پیٹریٹ میں ایسا مادہ ہوتا ہے جو گرمی کی طرف کھنچے۔ چنانچہ وہ گرمی کی رہنمائی میں اسکڈ تک پہنچ جاتا ہے اور اس سے ٹکرا کر اس کو درمیان ہی میں برباد کر دیتا ہے۔

اس دنیا میں ہر چیز کی ایک کمزوری ہے۔ ہر چیز خود اپنے ساتھ اپنا ایک توڑ لیے ہوئے ہے۔ اگر آپ اس توڑ کو جان لیں تو ہر چیز کا مقابلہ نہایت کامیابی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ ہر مخالف چیز کو خود اسی کے ہتھیار کی مدد سے شکست دے سکتے ہیں۔

۷ فروری ۱۹۹۱

روزنامہ ہندستان ٹائمس (۶ فروری) میں سعودی عرب کے سابق آئل منسٹر احمد ذکی یمانی کا ایک بیان پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ تیل کی وجہ سے ہے، انھوں نے سویڈش روزنامہ (Svenska Dagbladet) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مستقبل میں جس کے ہاتھ میں تیل کے ذرائع ہوں گے، وہی دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہوگی :

> ...in future the power which will have oil resources in its hands will be the superpower of the world.

انھوں نے کہا کہ خلیج فارس چونکہ تیل کے عالمی ذخیرہ کا ۷۵ فی صد حصہ رکھتا ہے، خلیج میں امریکی غلبہ کا مطلب یہ ہوگا کہ امریکہ اس کے ذریعہ اس قابل ہو جائے گا کہ وہ مستقبل کے بین اقوامی حالات میں تیل کو ایٹم بم کے بدل کے طور پر استعمال کر سکے :

> ...because the Persian Gulf has 75 per cent of the entire resources of the world, a U.S. domination of Gulf oil would mean it would be able to use as an alternative to atomic bomb in future international developments (p. 12).

مزید یہ کہ آج ہی کے اخبار میں امریکی صدر مسٹر جارج بُش کا ایک بیان چھپا ہے۔ انھوں نے واشنگٹن میں کہا کہ خلیج کی جنگ امریکہ کی آخری جنگ ہوگی۔ اس کے بعد نئے عالمی نظام کی وجہ سے کوئی اور جنگ لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی :

> ...the Gulf war would be America's last war. There would be no need to fight another one because of the new world order (p. 12).

دور اول میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سیاسی اقتدار دیا۔ اس کے ذریعہ وہ ساری دنیا میں اسلام کا دبدبہ قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ موجودہ زمانہ میں دوبارہ اللہ کی مدد سے مسلم دنیا کے نیچے تیل کا قدرتی خزانہ نکل آیا جو صنعتی دور میں سپر پاور بنانے کا ذریعہ ہے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ ان کے اثاثہ کے ذریعہ دوسری قوم عالمی سپر پاور بن رہی ہے اور خود مسلمانوں کے حصہ میں مغلوبیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

خارجی مواقع کو استعمال کرنے کے لیے داخلی طاقت درکار ہے، داخلی کمزوری کے ساتھ خارجی مواقع کو استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ داخلی طاقت کے بغیر خارجی مواقع کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک شخص کا جسم ہو مگر اس سے اس کی روح نکل گئی ہو۔

۸ فروری ۱۹۹۱

قومی آواز (۸ فروری) اور دوسرے اخبارات میں یہ رپورٹ چھپی ہے کہ پاکستان کی سیاست اس وقت بحران میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی حکومت خلیج کے مسئلہ میں سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے مگر وہاں کے عوام پر جوش طور پر صدام حسین کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے وزیر اعظم نواز شریف نے ۵ جنوری کو سارے ملک میں یوم کشمیر منایا۔ اس کا مقصد خلیجی مسئلہ سے عوام کی توجہ کو ہٹانا تھا۔ مگر حکومتی سطح پر اس کو کامیاب کرنے کی ساری کوششوں کے باوجود یوم کشمیر کامیاب نہ ہوسکا۔

یہی صورت حال زیادہ بڑے پیمانہ پر عرب دنیا کی ہے۔ وہاں واضح طور پر مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے ہیں۔ خواص کا ایک طبقہ سعودی عرب اور امریکہ کے ساتھ ہے۔ مگر عوام بالکل طوفانی انداز میں صدام حسین کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ صورت حال موجودہ زمانہ کی مسلم قیادت کی ایک بہت بڑی کمزوری کو بتاتی ہے۔ اور وہ ہے : سیاست کو حقیقت پسندانہ بنیاد پر چلانے کے بجائے جذباتی بنیادوں پر چلانا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد فلسطین کا جو مسئلہ پیدا ہوا وہ بلاشبہ ایک سنگین مسئلہ تھا، اس معاملہ میں صحیح طریقہ یہ تھا کہ قول اور عمل میں تناسب کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی مہم چلائی جاتی۔ مگر مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے لوگوں نے یہ کیا کہ عملی امکانات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ بڑے بڑے الفاظ بولتے رہے۔ پچھلے پچاس برس میں ان کا حال یہ رہا کہ تقریر اور تحریر کے ہر موقع پر "قبلہ اول" کے معاملہ میں لوگوں کو جذباتیت کی خوراک دیتے رہے۔ یہاں تک کہ مشرق سے مغرب تک تمام مسلم عوام فلسطین کے مسئلہ میں آخری حد تک جذباتی ہو گئے۔

موجودہ مسلمان اسی قسم کی لفظی جذباتیت پر بنی ہوئی قوم تھے۔ صدام حسین نے اسی کا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں سے کہا کہ "تم فلسطین کو یہودیوں سے خالی کراؤ، اس کے بعد ہم بھی کویت سے اپنی فوجیں واپس بلالیں گے۔" صدام حسین کا یہ بیان محض ایک خوش نما نعرہ تھا، مگر مسلمان، جن کو پہلے ہی نعرہ پسند بنایا جا چکا تھا، وہ عین اپنے مزاج کے تحت اس لفظی نعرہ کی طرف دوڑ پڑے۔

سیاست کا تعمیری طریقہ یہ ہے کہ کسی معاملہ میں عوام کو ضرورت سے زیادہ حساس نہ بنایا جائے۔ جب بھی ایسا کیا جائے گا تو یہی ہوگا کہ عوام سنجیدہ معاملہ کی اہمیت کو نہیں سمجھیں گے اور جس چیز میں انھیں مبالغہ آمیز حساسیت میں مبتلا کیا گیا ہے اس کی طرف ہجوم کر کے دوڑ پڑیں گے۔

۹ فروری ۱۹۹۱

دکتور عبد الرحمٰن العوضی کویت کی حکومت کے ایک وزیر ہیں۔ وہ امیر کویت کے خصوصی نمائندہ کے طور پر نئی دہلی آئے۔ یہاں انھوں نے حکومت ہند کے ذمہ داروں سے ملاقات کی۔ ۸ فروری ۱۹۹۱ کو انھوں نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کی۔ اس کی تفصیلات آج کے اخباروں میں شائع ہوئی ہیں۔

دکتور العوضی نے اس کا اعتراف کیا کہ اس وقت مسلم دنیا میں صدام نوازی کا طوفان آیا ہوا ہے اور امریکہ کو ظالم قرار دے کر اس کی مذمت کی جا رہی ہے۔ مگر اس کی وجہ سوچ کا فرق ہے۔ انھوں نے کہا کہ خلیج کی جنگ ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو شروع نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ ۲ اگست ۱۹۹۰ سے ہی شروع ہو چکی تھی جب کہ عراق نے جارحیت کر کے کویت پر فوجی قبضہ کر لیا (قومی آواز، ۹ فروری ۱۹۹۱)

کویتی وزیر کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ جنگ کا آغاز صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کیا، اس لیے ہم کو صدام حسین جارح نظر آتے ہیں۔ مسلم عوام یہ سمجھ رہے ہیں کہ جنگ کا آغاز امریکہ نے ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو کیا۔ اس لیے انھیں نظر آتا ہے کہ اس معاملہ میں زیادتی امریکہ کی طرف ہے۔

اس کو میں نے پڑھا تو میں نے سوچا کہ یہ صرف خلیج کی موجودہ لڑائی کی بات نہیں ہے، یہی تمام نزاعات کی بات ہے۔ جو لوگ نزاع کے آغاز کو "۲ اگست" سے شمار کرتے ہیں وہ ایک فریق کو ذمہ دار بتاتے ہیں، اور جو لوگ نزاع کا آغاز "۱۷ جنوری" سے کرتے ہیں ان کے نزدیک ساری ذمہ داری دوسرے فریق کے خانہ میں چلی جاتی ہے۔

نزاع کی ہر کہانی میں پہلے عمل ہوتا ہے، اور اس کے بعد اس کا ردعمل۔ اس طرح اس کا ایک نصف اول ہوتا ہے، اور دوسرا اس کا نصف ثانی۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس طرح کے معاملہ میں پوری کہانی کو نہیں بتاتے۔ ہر آدمی اس حصہ کو لے لیتا ہے جو اس کے موافق ہو۔ کوئی حصۂ اول کو نمایاں کرتا ہے، اور کوئی حصۂ ثانی کو۔

جب بھی دو فریقوں میں کوئی ٹکراؤ یا فساد پیدا ہوتا ہے تو اس واقعہ کا ایک "۲ اگست" ہوتا ہے اور ایک اس کا "۱۷ جنوری"۔ جو لوگ واقعہ کو ۲ اگست کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو ایک فریق غلطی پر نظر آتا ہے، اور جو لوگ واقعہ کو ۱۷ جنوری کے اعتبار سے دیکھتے ہیں ان کو دوسرا فریق غلطی پر دکھائی دیتا ہے۔ تاہم اسلامی نقطۂ نظر سے "۲ اگست" والا فریق ہی غلط ہے، کیونکہ : البادئ اظلم (آغاز کرنے والا زیادہ ظالم ہے)

۱۰ فروری ۱۹۹۱

پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے امن مشن کے تحت چھ مسلم ملکوں کا دورہ کیا۔ جنوری ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں وہ ایران، ترکی، شام، اردن، مصر اور سعودی عرب گئے۔ ہر جگہ وہ حکومت کے سربراہوں سے ملے اور خلیج کی جنگ کو روکنے کے لیے بات چیت کی۔ ہندستان ٹائمس (۱۰ فروری) کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے "گلف پیس مشن" کے تحت دوسرے دورہ پر روانہ ہوئے ہیں۔ اس دورہ میں وہ الجیریا، مراکو، تیونس اور لیبیا جائیں گے۔ اس سلسلہ میں وہ اسلام آباد میں عراقی سفیر اسماعیل حمودی حسین سے بھی کئی بار مل چکے ہیں۔ اردن کے شاہ حسین کے ذریعہ انھوں نے اپنا پیغام صدام حسین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

پاکستانی روزنامہ نوائے وقت (۲ فروری ۱۹۹۱) کے صفحہ اول کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ مسٹر نواز شریف نے اسلام آباد میں وزیر اعظم سکرٹریٹ میں ملک کی سیاسی و مذہبی جماعتوں کے قائدین اور دوسرے ممتاز سیاست دانوں سے خلیج کی صورت حال پر گفتگو کی اور اپنے "امن مشن" کی تفصیلات سے انھیں آگاہ کیا۔ "وزیر اعظم نواز شریف نے کہا کہ ہم نے صدر صدام حسین سے صرف تین لفظوں کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ ایک مرتبہ یہ کہہ دیں کہ آئی ول ود ڈرا (I will withdraw) تو پھر باقی کام آسان ہو جائے گا"۔ یعنی میں کویت سے اپنی فوج واپس بلا لوں گا۔

مسٹر نواز شریف کا یہ بیان صرف ان کی سادہ لوحی کا ثبوت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مذکورہ تین لفظ (آئی ول ود ڈرا) کی بات نہیں، بلکہ ایک اور تین لفظ آئی واز رانگ (I was wrong) کی بات ہے۔ اور یہ دوسرا تین لفظ ایسا ہے جس کو کہنے والا آج کی دنیا میں کوئی نہیں، حتی کہ خود پاکستان کے اسلام پسند لیڈر بھی نہیں۔

"میں نے غلطی کی" کہنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ یہ در اصل اپنے آپ کو رد کرنا ہے۔ یہ خود اپنی زبان سے اپنی نفی کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ جملہ کہنے کے لیے بہت بڑا حوصلہ درکار ہے۔ چونکہ لوگوں میں اتنا بڑا حوصلہ نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اس جملہ کو اپنی زبان سے دہرانے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے۔

آدمی جب ایک بات بول دے یا وہ ایک اقدام کر بیٹھے تو اس کے بعد وہ اس کو اپنے لیے وقار کا مسئلہ بنا لیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اگر میں نے اپنے کو غلط کہا یا اپنے اقدام کو واپس لیا تو لوگوں کی نظر میں بے قیمت ہو جاؤں گا۔ یہ اندیشہ اس کو اعتراف سے روک دیتا ہے۔ اپنے خیالی وقار کو بچانے کے لیے وہ اپنے پورے وجود کو اور بعض اوقات پوری قوم کو تباہی کے گڑھے میں گرا دیتا ہے۔

۱۱ فروری ۱۹۹۱

عراق کے حکمراں صدام حسین نے ۱۹۸۰ میں اپنی فوجیں ایران کے اندر داخل کر دیں۔ اس وقت ان کا نعرہ تھا کہ الطریق الی القدس یمرّ بطھران (قُدس کا راستہ تہران سے گزرتا ہے) مگر آٹھ سال کی باہمی لڑائی کے بعد ۱۹۸۸ میں دونوں کے درمیان جنگ بندی ہوئی تو حال یہ تھا کہ قُدس پر یہودیوں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ البتہ دو مسلم ملکوں کی آپس کی جنگ میں دونوں طرف کے لاکھوں آدمی مارے گئے اور کھربوں روپے کی دولت ضائع ہو گئی۔

صدام حسین نے دوسری بار اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کر دیا۔ کویت ایک بے حد چھوٹا ملک تھا، وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکا۔ چنانچہ عراق کی فوجیں اس پر قبضہ کر کے بیٹھ گئیں۔ اس جارحانہ اقدام کے متعلق بھی دوبارہ صدام حسین کا نعرہ ہے کہ الطریق الی القدس یمرّ بالکویت (قُدس کا راستہ کویت سے گزرتا ہے)

دونوں بار مسلم دنیا کے بہت سے لوگ اس نعرہ کے فریب میں آگئے۔ انھوں نے صدام حسین کی حمایت کرنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یقین کر لیا کہ صدام حسین تہران اور کویت سے ہو کر یروشلم میں داخل ہونا چاہتا ہے تاکہ قُدس (بیت المقدس) کو آزاد کرائے۔ ان مسلمانوں میں سے کسی نے یہ نہ سوچا کہ صدام حسین کو اگر یروشلم پر قبضہ کرنا تھا تو ان کو بغداد سے سیدھے یروشلم کی طرف مارچ کرنا چاہیے تھا، انھوں نے اس مقصد کے لیے یہ ٹیڑھا راستہ کیوں اختیار کیا کہ پہلے تہران اور کویت پر قبضہ کرو، اس کے بعد یروشلم کی طرف اقدام کرو۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی بے شعوری ہے جس کی وجہ سے وہ جھوٹے نعروں کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں۔ اگر مسلمان ایک باشعور قوم ہوتے تو وہ صدام حسین کے جارحانہ اقدام کی کبھی حمایت نہ کرتے، مگر مسلمانوں کی بے شعوری کی وجہ سے صدام حسین کو مسلم دنیا میں اپنے بہت سے حامی مل گئے۔

اسی بے شعوری کی بنا پر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف الفاظ کو جانتے ہیں، معانی کی انھیں خبر نہیں۔ وہ باتوں کو صرف ظاہری سطح پر دیکھتے ہیں، وہ باتوں کو اندرونی سطح پر دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ اپنے جذبات سے واقف ہیں مگر خارجی دنیا کے حقائق کا انھیں پتہ نہیں۔ وہ سچے اقدام اور جھوٹے اقدام کا فرق نہیں جانتے۔ اور جو لوگ سچے اقدام اور جھوٹے اقدام کا فرق نہ جانیں، ان کو کوئی بھی چیز بربادی کی چھلانگ سے بچانے والی نہیں۔

اس دنیا میں "فرق" کو جاننا سب سے بڑی دانائی ہے۔ اور فرق کو نہ جاننا سب سے بڑی نادانی۔

۱۲ فروری ۱۹۹۱

" المجلۃ "ایک عربی ہفت روزہ ہے۔ وہ جدہ میں چھپتا ہے اور لندن سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۲ فروری ۱۹۹۱ میں کویت کے ایک وزیر الدکتور عبد الرحمٰن العوضی کا انٹرویو شائع ہوا ہے۔ اس انٹرویو کے سوالات وجوابات کا تعلق خلیج کی موجودہ صورت حال سے ہے۔

المجلہ کے نمائندہ نے دکتور العوضی سے پوچھا کہ آئندہ کویت کا مستقبل داخلی اعتبار سے کیا ہوگا (کیف سیکون مستقبل الکویت داخلیا) دکتور العوضی نے اس کا جو جواب دیا، اس کا ایک جزیہ تھا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ماضی کے تجربہ سے سبق سیکھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اور شاید سب سے بڑی غلطی جس میں ہم مبتلا ہوئے، وہ یہ تھی کہ ہم نے ایسے شخص کے اوپر اعتماد کیا جو اس کا مستحق نہ تھا (ینبغی أن نتعلّم من دروسنا السابقۃ ونستفید منها۔ ولعلّ إهمّ خطأ وقعنا فیہ هو وضع ثقتنا فی من لایستحقها) صفحہ ۲۷

کویت نے عراقی صدر کو اپنا عرب بھائی سمجھ کر ان کے اوپر اعتماد کیا اور بلینوں ڈالر کے ذریعہ ان کی مدد کی۔ مگر عراقی صدر نے اپنے آپ کو طاقتور بنا کر خود اپنے محسن کے اوپر حملہ کر دیا۔ چنانچہ اب کویت کے ذمہ دار اعلان کر رہے ہیں عراقی صدر بھروسہ قابل نہیں۔

مگر عجیب بات ہے کہ عین اسی وقت ساری دنیا کے مسلمانوں نے عراقی صدر کی تقریروں سے متاثر ہو کر دوبارہ ان کے اوپر سب سے زیادہ بھروسہ کر لیا ہے۔ وہ ان کو اپنا حمایتی اور اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں مسلم عوام حال میں وہی غلطی کر رہے ہیں جو کویتی حکمرانوں نے ماضی میں کی۔ دونوں نے عراقی صدر کی باتوں کی بنیاد پر ان کے بارہ میں اپنی رائے قائم کی۔ حالانکہ اصل قابل لحاظ چیز کردار ہے نہ کہ بات۔ امام مالک نے قاسم بن محمد تابعی کے بارہ میں نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے :

أدرکتُ الناسَ وما یَعجَبُون بالقولِ۔ إنما یُنظَرُ إلی عملهِ ولا یُنظَر إلی قولهِ (موطا، صفحہ ۷۰۲)	میں نے ایسے لوگ (صحابہ) دیکھے ہیں جو قول کو کچھ بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دراصل آدمی کا عمل دیکھا جائے گا، اس کا قول نہیں دیکھا جائے گا۔

کتنا زیادہ فرق ہے صحابہ کی سوچ میں اور موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سوچ میں۔

۱۳ فروری ۱۹۹۱

نوائے وقت (۱۳ فروری) میں ملک امجد حسین ایڈوکیٹ کا مضمون چھپا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خلیج کی جنگ نے پاکستانی عوام کو جذبات کی رو میں بہادیا۔ وہ حقائق کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک صدام حسین اسلام کے ہیرو ہیں اور انھوں نے فلسطین کے مسئلہ کو زندہ کیا ہے۔ کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں ان کا کہنا ہے کہ کویت تو عراق ہی کا حصہ تھا۔ اس کو ۱۹۱۸ میں انگریز نے اس سے علٰحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کا درجہ دے دیا۔

مضمون نگار کے جواب کا ایک پیراگراف یہ ہے: اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انگریز نے اپنی مصلحت کے تحت ۱۹۱۸ میں کویت کو عراق سے علٰحدہ کر کے ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں تبدیل کیا تب بھی ایسا کہنا حقیقت کا تقاضا نہیں۔ اس طرح تو پاکستان بھی ۴۴ سال پہلے ہندستان کا حصہ تھا۔ اور بھارت والے یہ موقف اختیار کر سکتے ہیں کہ انگریز نے اپنے مفاد کے لیے اس کو ہندستان سے کاٹ کر ایک علٰحدہ ریاست بنا دیا، یہ کہہ کر وہ زبردستی پاکستان پر قبضہ کر لیں۔ ایسا خیال تاریخی اور واقعاتی طور پر درست نہیں۔ (صفحہ ۲)

اسی کا نام دہرا منطق ہے، اور دہرا منطق مسلمانوں کا خاص مزاج ہے۔ کویت پر عراقی قبضہ کے لیے وہ جس منطق کو درست سمجھتے ہیں، اسی منطق کو پاکستان پر ہندستانی یا فلسطین پر یہودی قبضہ کے لیے درست ماننے پر تیار نہیں۔

لکھنؤ کے عربی پرچہ الرائد (یکم فروری ۱۹۹۱) نے محمد وجدی قندیل کا ایک مضمون نقل کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے ــــــ خلیجی لڑائی کا ذمہ دار کون (مَن المسئول عن الحرب) مضمون نگار نے خلیج کی جنگ کے تباہ کن نقصانات کا ذکر کیا ہے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ جنگ کی اس آگ کو بھڑکانے کا ذمہ دار کون ہے، وہ کون ہے جس نے عراق کے اوپر جہنم کے دروازے کھول دیے۔ حقائق بتاتے ہیں کہ یہ صدام حسین ہیں جو اس جنگ کا سبب بنے۔ عراقی لیڈر شپ ہی اس ہیبت ناک المیہ کی ذمہ دار ہے جس کا سامنا عراق کو ہے (القیادۃ العراقیۃ ھی التی تتحمل المسئولیۃ عن الماساۃ الرھیبۃ التی یتعرض لھا العراق) صفحہ ۶

یہ بات اسلامی اصول کے عین مطابق ہے۔ اسلام میں سبب کو دیکھا جاتا ہے نہ کہ نتیجہ کو۔ اس طرح کے معاملات خواہ جہاں بھی ہوں، صاحب سبب کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

مگر یہ سراسر اسلام کے خلاف ہے کہ آدمی ایک جگہ ایک دلیل استعمال کرے اور دوسری جگہ دوسری دلیل۔ ایک معاملہ میں وہ ایک طریقہ کا حامی ہو اور دوسرے معاملہ میں وہ دوسرے طریقہ کی حمایت کرنے لگے۔

۱۴ فروری ۱۹۹۱

لندن سے شائع ہونے والے عربی المجلۃ (۱۳-۱۹ فروری ۱۹۹۱) میں الدکتور تحسین معلا کا انٹرویو چھپا ہے۔ موصوف نے جامعہ بغداد میں میڈیکل تعلیم حاصل کی ہے۔ ایک زمانہ میں وہ صدام حسین کے ذاتی معالج رہ چکے ہیں۔

دکتور معلا نے جنگ کے نتیجہ میں عراق کی تباہی کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ عراقی قوم آج سخت ترین مصیبت میں مبتلا ہے۔ اور یہ بلاشبہ ہر انسان کے لیے تکلیف دہ ہے۔ مگر ان مصیبتوں کا اصل ذمہ دار انھوں نے "اتحادی طاقتوں" کو نہیں قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ اس کی ذمہ داری تمام تر عراقی لیڈر شپ پر ہے۔ عراق صدام حسین کے جرائم کی قیمت ادا کر رہا ہے (العراق یدفع ثمن جرائم صدام حسین) صفحہ ۴۳

اسی طرح ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۱۴ فروری ۱۹۹۱) میں اس کے "المحرر السیاسی" کے قلم سے دو صفحہ کا ایک جائزہ چھپا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ جنگ کے نتیجہ میں فلسطینیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے، وہ ان عرب ملکوں سے کٹ گئے جو بلینوں ڈالر کے ذریعہ مسلسل ان کی مدد کر رہے تھے اور اپنے یہاں ان کو عزت کی جگہ دیے ہوئے تھے۔ وہ اس قسم کے تمام فوائد سے محروم ہو گئے۔

اس نقصان اور محرومی کا سبب عرب ممالک یا کوئی اور نہیں ہے بلکہ خود فلسطینیوں کی اپنی قیادت ہے۔ فلسطینی قوم نے بہت مہنگی اور بہت بھاری قیمت ادا کی ہے، اور اس کا سبب بعض فلسطینی لیڈروں کا وہ موقف ہے جو انھوں نے کویت پر قبضہ کے سلسلہ میں صدام حسین کے جرائم کی تائید کر کے اختیار کیا۔ (ان الشعب الفلسطینی دفع الثمن غالیاً و باهظاً بسبب الموقف الذی اتخذته بعض القیادات الفلسطینیۃ بتایید اجرام صدام حسین فی احتلاله لدولۃ الکویت) صفحہ ۸

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف کویت اور عراق سے نہیں ہے بلکہ ساری دنیا سے ہے۔ ہر جگہ (بشمول ہندستان) آج مسلمانوں کو جن مشکلات اور مصائب کا سامنا ہے، ان سب کی واحد ذمہ داری موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں پر آتی ہے نہ کہ مفروضہ "اسلام دشمنوں" پر۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈروں نے، تقریباً بلا استثناء، مسلمانوں کی نہایت غلط رہنمائی کی۔ وہ ان کو جذباتی نعروں پر دوڑاتے رہے۔ اس کے نتیجہ میں خود ان لیڈروں کو تو شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گئی۔ مگر مسلم عوام کے حصہ میں اس کے سوا کچھ نہ آیا کہ ان کی مشکلات میں مزید بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

۱۵ فروری ۱۹۹۱

آج کی ڈاک سے لاہور کا ماہنامہ آئین (فروری ۱۹۹۱) ملا۔ یہ جماعت اسلامی پاکستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ۲۶ جنوری کو جماعت اسلامی پاکستان کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس لاہور میں ہوا۔ اس میں خلیج کے مسئلہ سے متعلق ایک قرارداد اتفاق رائے سے منظور کی گئی۔

قرارداد میں کہا گیا ہے کہ امریکہ خلیج کی یہ جنگ اپنے سامراجی مقاصد اور سیاسی عزائم کے لیے کر رہا ہے۔ اس کو فوری طور پر بند ہونا چاہیے۔ اور یہ کہ "یہ پوری دنیا کے مسلمانوں اور امن پسند انسانوں کے دل کی پکار ہے۔ اور امریکہ اور اس کے اتحادیوں اور عراق دونوں کو ضد اور ہٹ دھرمی کی روش ترک کر کے امن کی اس اپیل پر لبیک کہنا چاہیے۔"

جماعت اسلامی کی یہ اپیل میرے نزدیک کھوکھلے الفاظ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ کیوں کہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا یہ ظالمانہ اقدام اپنے ذاتی انٹرسٹ کے تحت ہوا ہے، اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ ہو وہاں کوئی بھی اپنی ضد کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ حتی کہ خود مذکورہ اپیل کرنے والے لوگ بھی نہیں۔

اس کی ایک مثال خود پاکستان کا واقعہ ہے۔ پاکستان کے سابق فوجی صدر جنرل ضیاء الحق نے مسٹر بھٹو پر مقدمہ چلا کر عدالت سے پھانسی کا فیصلہ حاصل کیا۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اور جماعت اسلامی نے پوری طرح اس معاملہ میں جنرل ضیاء الحق کی تائید کی۔ جب مسٹر بھٹو کی پھانسی کا اعلان ہوا تو تمام دنیا کے ممالک (بشمول مسلم ممالک) نے اپیل کی کہ بھٹو کو پھانسی نہ دی جائے۔ مگر جماعت اسلامی اور جنرل ضیاء الحق نے اس عمومی اپیل کی پروا نہ کی اور بھٹو کو پھانسی پر چڑھا دیا۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ بھٹو کا زندہ رہنا ان کی اپنی سیاسی موت کے ہم معنی ہوگا۔

آج تمام لوگوں کا یہ حال ہے کہ جہاں ان کا ذاتی انٹرسٹ ہو وہاں وہ کسی کی بات نہیں سنتے۔ ایسے لوگ دوسروں کو کس طرح نصیحت کر سکتے ہیں کہ تم اپنے انٹرسٹ کو نظر انداز کر کے دوسروں کی بات سنو اور اپنے اقدام کو واپس لے لو۔ لوگوں کے پاس دوسروں کے لیے اصول ہے اور اپنے لیے مفاد۔ اس معاملہ میں لوگوں کا حال وہی ہے جو برطانی ادیب ڈبلیو ایس لینڈر (۱۸۶۴-۱۷۷۵) نے کہا تھا کہ ہم اصول کی بات کرتے ہیں مگر ہم مفاد پر عمل کرتے ہیں:

We talk on principle, but we act interest.

۱۶ فروری ۱۹۹۱

المجلۃ (۱۳-۱۹ فروری) میں ایک احتجاجی جلوس (تظاھرۃ) کی تصویر ہے۔ یہ امریکہ میں بسنے والے عراقیوں کا جلوس ہے۔ وہ مختلف تختیاں اٹھائے ہوئے سڑک پر چل رہے ہیں۔ ایک تختی پر لکھا ہوا ہے:
الجالیۃ العراقیۃ غیر مسئولۃ عن جرائم صدام (عراقی مہاجرین صدام کے جرائم کے ذمہ دار نہیں)

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ میں تین ملین عرب ہیں۔ ان میں ۸۰ ہزار عراق سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان عربوں کی دوسری نسل (بیٹوں اور پوتوں) میں اپنے قدیم وطن سے زیادہ گہرا لگاؤ نہیں۔ مگر پہلی نسل جو عرب سرزمین میں پیدا ہوئی تھی، وہ اپنے آبائی وطن سے بہت گہرا قلبی تعلق رکھتی ہے، ایک امریکی عرب نے کہا:

ھا انا اری وطنی الذی اخترتہ و وطنی الذی ولدتُ فیہ یتحاربان۔ ھا انا اری وطن اولادی واحفادی فی حرب مع وطن آبائی واجدادی (صفحہ ۵۸)

آج میں دیکھتا ہوں کہ جس وطن کو میں نے اختیار کیا اور جس وطن میں میں پیدا ہوا دونوں ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے بیٹوں اور پوتوں کا وطن میرے باپ اور دادا کے وطن سے برسرِ جنگ ہے۔

اسی طرح عرب اصل سے تعلق رکھنے والے (نیز دوسرے ملکوں کے مسلمان) بڑی تعداد میں فرانس، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں آباد ہیں۔ ہر جگہ وہ اسی نفسیاتی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ملکوں میں یہ لوگ شک کی نظر سے دیکھے جا رہے ہیں۔ مقامی باشندے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ حتی کہ جگہ جگہ ان کے خلاف تشدد کے واقعات ہو رہے ہیں۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ساری دنیا میں مسلمانوں کا وہی حال ہو جائے گا جو حال ان کا ہندستان میں ۱۹۴۷ کے بعد ہوا ہے۔ مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں یہ مسلمان عزت اور خوش حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مگر اب وہ ان ملکوں میں ذلت اور مشکلات کے درمیان رہنے پر مجبور ہوں گے۔ اس کی ذمہ داری اگرچہ وہ مغرب کی مفروضہ "اسلام دشمنی" کے خانہ میں ڈالیں گے۔ مگر باعتبار حقیقت اس کی ذمہ داری خود مسلم لیڈروں کے سوا کسی اور کے اوپر نہ ہوگی ــــــ دورِ اول کے مسلمان دوسرے ملکوں میں دعوت اسلام کے لیے گئے۔ انھوں نے دوسرے ملکوں کے مسائل کو حل کیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان دوسرے ملکوں میں طلب معاش کے لیے گئے۔ وہ خود مسائل کا شکار ہو کر رہ گئے۔

۱۷ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری) کے ایڈیٹوریل کی سرخی یہ تھی: پیکس امریکانا (Pax Americana) یعنی امریکی امن۔ میڈیٹیرینین کے علاقہ میں رومیوں نے وسیع سلطنت قائم کی جو ۲۷ ق م سے لے کر ۱۸۰ء تک رہی۔ اس زمانہ میں رومی اقتدار کے تحت اس علاقہ میں جو سیاسی امن قائم ہوا اس کو انھوں نے پیکس رومانا سے تعبیر کیا۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد عالمی سیاست میں امریکہ کو غالب کردار ادا کرنے کا جو موقع ملا اس کی بنا پر اس عہد کو پیکس امریکانا سے تعبیر کیا جانے لگا۔ مگر اس دور میں امریکہ کے علاوہ سودیت یونین کو بھی سپر پاور کی حیثیت حاصل رہی۔ اس بنا پر پیکس امریکانا کا لقب صرف جزئی طور پر ہی امریکہ پر صادق آتا تھا۔ اب حالات مکمل طور پر بدل گئے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا نے اپنے مذکورہ ایڈیٹوریل میں بالکل درست طور پر لکھا ہے کہ دو طاقتی دنیا کا نظام جس کو سرد جنگ نے پیدا کیا تھا وہ نومبر ۱۹۸۹ میں دیوار برلن کے ساتھ ڈھ گیا۔ اس کے کھنڈر سے ایک واحد طاقتی دنیا کا نظام ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ خلیجی جنگ نے اس عمل کو حیران کن رفتار کے ساتھ تیز کر دیا ہے:

> The bi-polar world order created by the Cold War collapsed along with the Berlin Wall in November 1989. A more and more uni-polar world began to emerge from the rubble. That process has now accelerated with dizzying speed. (p. 1)

آج ٹائمس آف انڈیا (۱۷ فروری) میں فرانسیسی مؤرخ (Amaury de Riencourt) کا انٹرویو چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صدیوں کے تاریخی عمل اور امریکہ کی غیر معمولی مادی ترقی جس طرف جا رہی ہے وہ یہی ہے کہ آنے والا دور پیکس امریکانا کا دور ہو۔ یہ امریکہ کا شاہانہ مقدر ہے کہ وہ بیسویں صدی کا روم بنے:

> It is America's imperial destiny to be the Rome of the twentieth century (p. 12).

یہ بات بطور واقعہ درست ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے دانش مندی یہ ہے کہ وہ امریکہ کی سیاسی چٹان سے اپنا سر نہ ٹکرائیں۔ بلکہ اسلام کے دعوتی مشن کو لے کر اٹھیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو عین ممکن ہے کہ دورِ امریکہ مستقبل میں دورِ اسلام بن جائے۔ کوئی بھی غلبہ دعوتی مواقع کو ختم نہیں کرتا۔ اور جہاں دعوتی مواقع موجود ہوں وہاں گویا وہ سب کچھ موجود ہے جس کی اسلام کو ضرورت ہے۔

۱۸ فروری ۱۹۹۱

ہندستان ٹائمس (۱۸ فروری) میں ایک خوش کن خبر شائع ہوئی ہے۔ واشنگٹن کی ڈیٹ لائن کے ساتھ چھپنے والی اس خبر کا عنوان ہے ـــــــ خلیج کی جنگ کے بعد کسی بھی منصوبہ میں انڈیا اپنا رول چاہتا ہے:

India wants a role in post-war plan

خبر میں بتایا گیا ہے کہ نئی دہلی کی ہدایات کے تحت امریکہ کے ہندستانی سفیر مسٹر عابد حسین امریکہ کے سکرٹری آف اسٹیٹ (فار پولیٹکل افیرس) مسٹر رابرٹ کیمٹ (Robert Kimmit) سے ملے۔ ہندستانی سفیر نے امریکی حکومت سے یہ درخواست کی کہ جنگ کے بعد ویسٹ ایشیا کی بحالی کا جو نقشہ بنایا جائے، اس میں انڈیا کی رائے کو بھی شریک کیا جائے۔ علاقہ کی تعمیرِ نو کے پراسس میں انڈیا کا بھی بطور ایک پارٹنر شامل کیا جانا ضروری ہے۔

ہندستانی سفیر نے مسٹر کیمٹ سے کہا کہ انڈیا جیسا ایک ملک اس علاقہ میں نہایت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ اور امریکہ کو چاہئے کہ وہ انڈیا کی ترقی میں مزید بہت زیادہ دلچسپی لے:

> A country like India in the subcontinent has to play an extremely important role, and the US have got to take a lot more interest in India's development. (p. 12)

موجودہ حالت میں یہ درخواست محض نادانی کی ایک خواہش ہے جو کبھی پوری ہونے والی نہیں۔ اسی اخبار کے صفحۂ اول پر یہ خبر ہے کہ خلیج کے لئے جانے اور آنے والے امریکی ایرفورس کے ٹرانسپورٹ جہازوں کو بمبئی اور مدراس کے ایرپورٹ پر دوبارہ تیل لینے کی سہولت (refuelling facility) دی جارہی تھی۔ لیکن ہندستان کے سیاسی لیڈروں نے اس پر شور مچایا۔ چنانچہ حکومتِ ہند نے اس سہولت کو بند کر دیا ـــــ جس عمل میں انڈیا قیمتۃً تیل دینے کے بقدر بھی شریک نہ ہو، وہ اس عمل کے بعد اس کے انجام کی تشکیل میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔

اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ جو لوگ جوکھم کو برداشت کریں، وہی جوکھم کے بعد آنے والے نتیجہ کے مالک ہوں۔ موجودہ دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ جوکھم کوئی اور اٹھائے اور اس کا نتیجہ کسی دوسرے کو مل جائے۔ اس قسم کی خوش فہمی صرف ایک سادہ لوح انسان کے ذہن میں جگہ پا سکتی ہے۔ اس کے باہر ایسی خوش فہمی کا کوئی وجود نہیں۔

۱۹ فروری ۱۹۹۱

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ فروری) کی ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ بحرین کے ایک انٹرنیشنل ہوٹل میں ایک لطیفہ مشہور ہو رہا ہے کہ ایک پیٹریٹ روزانہ استعمال کرو اور اسکڈ کو دور بھگاؤ:

A Patriot a day keeps Scuds away

سوویت یونین نے اسکڈ کے نام سے خطرناک قسم کے دور مار میزائل بنائے۔ عراق نے ان کو بڑی تعداد میں خرید کر اپنے یہاں جمع کر لیا۔ عراق کے لئے ان کی حیثیت بے پناہ ہتھیار کی تھی۔ ان کے ذریعہ وہ سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں پر قیامت ڈھا دیتا۔ اس نے ظہران اور ریاض وغیرہ پر بہت سے اسکڈ پھینکے۔ مگر یہ شہر تباہی سے بچ گئے۔ اس کی وجہ امریکہ کے پیٹریٹ میزائل تھے۔ جنھوں نے فضا ہی میں عراقی اسکڈ سے ٹکرا کر انھیں تباہ کر دیا۔

سوویت یونین نے جب اسکڈ بنائے تو امریکہ نے اس کے اس اہم فوجی راز کو دریافت کیا اور اس کا توڑ تیار کرنے کے لئے ریسرچ شروع کر دی۔ اسی ریسرچ کا نتیجہ پیٹریٹ تھے۔ اسکڈ جب آواز سے چھ گنا زیادہ تیز رفتار کے ساتھ فضا میں اڑتا ہے تو پیٹریٹ فوراً ہی اس کا پتہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اسکڈ اپنے لانچر سے نکل کر نشانہ کی طرف چلتا ہے، عین اسی وقت پیٹریٹ بھی مخالف سمت سے اس کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ وہ پیچھا کر کے اسکڈ سے ٹکرا جاتا ہے اور اس کو نشانہ پر پہنچنے سے پہلے برباد کر دیتا ہے۔

امریکہ کی سازش اور دسیسہ کاری نہیں، بلکہ اس کی اسی قسم کی صلاحیت ہے جس نے اس کو خلیج میں آنے کا موقع دیا ہے۔ عربوں کے پاس عراقی اسکڈ کا کوئی توڑ نہ تھا۔ اس لئے وہ مجبور تھے کہ امریکہ کو دعوت دیں۔ حتی کہ اسی ٹائمس آف انڈیا میں واشنگٹن پوسٹ کے حوالہ سے یہ خبر چھپی ہے کہ آٹھ عرب ملک (مصر، شام، سعودی عرب، کویت، بحرین، عمان، قطر، عرب امارات) ابھی سے نقشہ بنا رہے ہیں کہ پندرہ بلین ڈالر سے ایک فنڈ قائم کریں اور امریکہ سے کہیں کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد بھی اس کی بحری اور فضائی فوجیں عرب کے آفاق کے اوپر (over the horizon) محسوس طور پر باقی رہیں تاکہ عرب ملکوں کے لئے بعد کو دوبارہ کوئی سیاسی مسئلہ پیدا نہ ہو سکے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی اصل کمزوری ان کی وسائل سے محرومی ہے۔ جب تک اس کمی کو دور نہ کیا جائے اسلام دشمنوں کی سازش اور دسیسہ کاری کے خلاف احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسی باتیں صرف جھنجھلاہٹ کو بڑھاتی ہیں، وہ مسئلہ کو حل نہیں کرتیں۔

۲۰ فروری ۱۹۹۱

ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۷ فروری ۱۹۹۱) کے موضوع الغلاف کا عنوان تھا کہ خاتمہ قریب آگیا (النہایۃ تقترب) اسی طرح المجلۃ (۲۷ فروری) کی کور اسٹوری کا عنوان ہے: معرکۃ تحریر الکویت: الفصل الاخیر۔ ٹائم جس پر ۲۵ فروری کی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ وہ حسب قاعدہ پیشگی طور پر مجھے آج ملا۔ اس کی کور اسٹوری خلیج کی جنگ ہے اور اس کا عنوان بھی یہی قائم کیا گیا ہے کہ خاتمہ کا آغاز:

Beginning of the end

اتحادی طاقتوں کی رات دن کی مسلسل بمباری نے عراق کی دو تہائی فوجی طاقت برباد کر دی۔ عراق کے شہر اور اس کے بیشتر اہم مقامات کھنڈر ہو گئے۔ صدام حسین جو آخری فتح سے پہلے نہ رکنے کی باتیں کرتے تھے، وہ اب جنگ بندی کی پیش کش کر رہے ہیں۔ ہولناک جنگ کے یک طرفہ خاتمہ کا آغاز شروع ہو چکا ہے۔ ٹائم کے مذکورہ شمارہ میں عراق کی تباہی کی دردناک تصویریں ہیں۔ ایک تصویر میں ایک عراقی عورت اپنے تباہ شدہ مکان کے ملبہ پر سر پکڑے ہوئے بیٹھی ہے۔ ایک تصویر میں مردہ عراقیوں کی لاشیں ٹرکوں میں لاد کر لے جائی جا رہی ہیں۔ ایک تصویر میں ایک وسیع کھنڈر کے اوپر بیٹھی ہوئی دو عورتیں رو رہی ہیں۔ ایک اور بڑے کھنڈر کے اوپر ایک عراقی مایوسی اور نامرادی کی حالت میں دکھائی دے رہا ہے۔ کسی تصویر میں پل ٹوٹے ہوئے ہیں کسی میں بڑی بڑی بلڈنگیں منہدم صورت میں نظر آرہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عراق کی یہ تباہی ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں ہونے والی تباہی سے ہزاروں گنا زیادہ سخت ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ کو ہندو فرقہ پرست بابری مسجد (اجودھیا) کی چہار دیواری توڑ کر اندر داخل ہو گئے اور اس کے گنبدوں پر بھگوا جھنڈا لہرا دیا۔ ملک میں وسیع پیمانہ پر فسادات پھوٹ پڑے۔ اسی کے ساتھ خلیج میں دشمن اسلام امریکہ کی فوجیں بہت بڑی تعداد میں جمع ہو گئیں۔ اب سارے ملک میں "قنوت نازلہ" پڑھی جانے لگی۔ مسلمان ہر طرف اللّٰھم دمّر دیارھم کی بد دعا کرنے لگے اور تمام اکابر و اصاغر نے اس پر آمین کہنا شروع کر دیا۔ یہ بد دعا تمام مسجدوں اور تمام اجتماعات میں جاری تھی۔ مگر ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو جب خدا کا فیصلہ ظاہر ہوا تو "تدمیر دیار" کا عمل کافروں کے بجائے خود مسلمانوں کے اوپر ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اب وہ آخری وقت آگیا ہے کہ مسلمان احتجاج غیر کا طریقہ چھوڑ دیں اور احتساب خویش کا طریقہ اختیار کریں۔

۲۱ فروری ۱۹۹۱ء

سعودی عرب کے شاہ فہد اور کویت کے امیر الصباح کی دعوت پر امریکہ اور دوسرے ۲۸ مغربی ملکوں کی فوجیں تقریباً پانچ لاکھ کی تعداد میں خلیج کے علاقہ میں جمع ہیں اور عراق صدر صدام حسین کے خلاف تباہ کن جنگ میں مصروف ہیں۔ صدام نواز مسلمان ساری دنیا میں اس پر سخت اعتراض کر رہے ہیں۔ ہندستان کے مسلم اخبارات میں اس قسم کی سرخیاں نظر آتی ہیں: اسلام عیسائیت کی چوکھٹ پر۔ عرب حکمرانوں نے کافروں کو سرزمین حرم میں داخل کر دیا، وغیرہ۔

سعودی حلقہ اس بارہ میں مختلف نقطۂ نظر رکھتا ہے۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۳۱ جنوری) میں اس سلسلہ میں الشیخ ابن باز کا فتویٰ چھپا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ مسلم حکمرانوں کے لئے اس میں کوئی شرعی نقصان نہیں کہ وہ غیر اسلامی حکومتوں سے مدد لیں جب کہ انھیں ایسی مدد کی ضرورت ہو (صفحہ ۶-۷) الدعوۃ (۲۱ فروری) میں دوبارہ الشیخ ابن باز کا مفصل مضمون چھپا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں سے مدد لینا جائز ہے جب کہ ظالم دشمن کو ہٹانے اور اس کو ہلاک کرنے اور بلادِ اسلامی کو اس کے شر سے بچانے کے لئے ضروری ہو، خواہ وہ غیر مسلم یہودی ہو یا عیسائی یا بت پرست۔ (سوار کان المستعان بہ یہودیا او نصرانیا او وثنیا، صفحہ ۲۱)

اصولی طور پر یہ بات درست ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب، مطعم بن عدی، عبد اللہ بن اریقط وغیرہ سے مدد لی اور یہ سب غیر مسلم تھے۔ الشیخ ابن باز نے جو دلیل دی ہے یہی دلیل ہندستان کے علماء نے ۱۹۴۷ کے پہلے دی تھی جب کہ انھوں نے تحریکِ حریت میں غیر مسلموں کو اپنے ساتھ لیا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے تعاون لیا تو اس کا نتیجہ اسلام کے غلبہ کی صورت میں نکلا۔ جب کہ علماء ہند کے تعاون کا نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔ اسی طرح یقینی ہے کہ خلیج کی جنگ کا سب سے بڑا فائدہ اسرائیل اور مغربی طاقتوں کو پہنچے گا اور سب سے بڑا نقصان عراق کو اور پھر مختلف انداز میں ساری مسلم دنیا کو۔

مدد کس کے لئے مفید ہوگی، اس کا انحصار اس پر ہے کہ مدد لینے سے پہلے کس نے اپنی بنیاد بنائی ہے۔ دورِ اول کے مسلمان خود اپنی مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس لئے مدد کا فائدہ ان کے حصہ میں آیا۔ موجودہ مسلمانوں کی اپنی کوئی بنیاد نہیں، اس لئے مدد کا فائدہ بھی ان کو نہیں ملتا۔

۲۲ فروری ۱۹۹۱

امریکہ کی زیر قیادت اتحادی فوجوں نے ۱۷ جنوری کو عراق پر بمباری کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب وہ عراق کی فوجی اور اقتصادی طاقت کو تقریباً توڑ چکے ہیں۔ اندازہ کے مطابق جلد ہی وہ زمینی حملہ شروع کر دیں گے جو یقینی طور پر چند دن سے زیادہ نہیں رہے گا۔ عراق کے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ ہوگی کہ وہ ذلت کے ساتھ ہتھیار ڈال دے (اتحادی فوجوں نے ۲۴ فروری ۱۹۹۱ء کو زبردست زمینی حملہ کرکے عراقی فوجیوں کا قتل عام شروع کر دیا)

ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں مقیم عراقی سفیر نے کہا ہے کہ خلیج کی جنگ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ سوویت روس اب سپر پاور نہیں رہا۔ وہ بڑی طاقت کی حیثیت سے ختم ہو چکا ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ روس اس جنگ میں امریکہ سے یا اقوام متحدہ سے ہمارے موافق کوئی تجویز منوانے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ عراق روس کو اپنا سب سے بڑا دوست سمجھتا تھا، مگر روس عراق کے کچھ کام آتا ہوا نظر نہیں آتا۔

لیکن عراقی سفیر کو روس کے دیوالیہ پن کے بجائے خود عراقی لیڈروں کے دیوالیہ پن کا شکوہ کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ روس اور امریکہ نے جون ۱۹۹۰ میں باقاعدہ طور پر سرد جنگ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا تھا۔ عراقی لیڈروں نے اس اعلان کی حقیقت نہیں سمجھی۔ اس کے بعد انھوں نے اگست ۱۹۹۰ میں کویت پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا۔ عراقی لیڈروں کی کارروائیاں بتاتی ہیں کہ وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ اس جنگ میں روس ان کی طرف سے کود پڑے گا جس طرح سرد جنگ کے زمانہ میں روس اور امریکہ ایک دوسرے کے خلاف کود پڑتے تھے۔ مگر روس کسی بھی درجہ میں عراق کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرد جنگ کا خاتمہ دونوں قوموں کے لئے برابری کا معاملہ نہ تھا۔ وہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ روس نے امریکہ کے مقابلہ میں سپر پاور کی حیثیت کھو دی ہے۔ مگر عراقی اپنی خوش فہمی کی بنا پر اس کو سمجھ نہ سکے۔

عراقی لیڈر کہہ رہے ہیں کہ اصل جنگ تو زمینی جنگ ہے۔ زمینی جنگ شروع ہوگی تو ہم یہاں کے صحرا کو امریکیوں کا قبرستان بنا دیں گے۔ مگر یہ محض بے خبری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کے دور میں جنگ کا فیصلہ فضا میں ہوتا ہے اور فضا کی جنگ امریکہ جیت چکا ہے۔ اب زمینی جنگ صرف اختتامی کارروائی کے ہم معنی ہوگی نہ کہ نئی جنگ شروع کرنے کے ہم معنی۔ خوش فہمی کے گنبد میں رہنا آسان ہے۔ مشکل صرف یہ ہے کہ حقائق کا بے رحم ہاتھ جب اس کو توڑتا ہے تو گنبد تو درکنار آدمی کے قدموں کے نیچے کی اینٹ بھی نہیں ہوتی جہاں وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔

۲۳ فروری ۱۹۹۱

صدام حسین ۱۷ جنوری سے پہلے، اور پھر جنگ شروع ہونے کے ابتدائی دنوں میں بڑی بڑی باتیں کرتے تھے۔ مگر امریکہ کی زیر قیادت اتحادی طاقتوں (allied forces) نے مسلسل بمباری سے عراق کی فوجی طاقت توڑ دی۔ پہلے وہ کسی بھی حال میں کویت سے اپنا قبضہ ہٹانے پر راضی نہیں تھے۔ وہ اعلان کر چکے تھے کہ کویت اب ہمیشہ کے لئے عراق کا ۱۹ واں صوبہ بن چکا ہے۔ مگر اب وہ بلا شرط کویت سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامندی کا اعلان کر رہے ہیں۔ آج اخبارات کے صفحہ اول کی پہلی خبر ان کا یہی اعلان ہے جو انھوں نے سوویت روس کے واسطہ سے کیا ہے۔ ہندستان ٹائمس (۲۲ فروری) کے پہلے صفحے کی جلی سرخی یہ ہے کہ عراق غیر مشروط واپسی پر رضامند:

Iraq agrees to unconditional pull-out

مگر اسی کے ساتھ دوسری سرخی یہ ہے کہ امریکہ نے قیام امن کی عراقی پیش کش کو رد کر دیا ہے۔ (US rejects peace offer) ۱۷ جنوری سے پہلے جب کہ جنگ شروع نہیں ہوئی تھی، امریکہ کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ عراق اپنی فوجوں کو کویت سے واپس بلالے۔ شاہ فہد نے اعلان کیا تھا کہ اگر صدام حسین کویت کو خالی کر دیں تو ان سے دوبارہ برادرانہ سلوک کیا جائے گا اور ان کی ہر طرح مدد کی جائے گی۔ مگر اس وقت صدام حسین نے بے نیازانہ طور پر اس کو رد کر دیا۔ اب باری امریکہ اور اس کے حلیفوں کی ہے۔ اب جبکہ عملاً وہ جنگ جیت چکے ہیں، اب وہ صدام حسین کو کچلنے سے کم کسی چیز پر راضی ہونے والے نہیں۔

صدام حسین کا موجودہ جھکاؤ صرف ان کی نادانی کو ظاہر کرتا ہے۔ دانش مند آدمی جو کچھ کرتا ہے وہی بیوقوف آدمی بھی کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دانش مند آدمی تباہی سے پہلے کرتا ہے اور بیوقوف آدمی تباہی دیکھنے کے بعد۔ اسی لئے فارسی شاعر نے کہا ہے کہ آدمی ایسا اقدام کیوں کرے جس کا نتیجہ شرمندگی ہو:

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

اقدام وہ ہے جو کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچے۔ جو اقدام صرف بربادی پر ختم ہو وہ خودکشی کی چھلانگ ہے نہ کہ کوئی واقعی اقدام۔ بدقسمتی سے موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما تقریباً سب کے سب اسی قسم کے جھوٹے اقدام میں مشغول نظر آتے ہیں۔ ان کے غیر حقیقت پسندانہ اقدامات نے مسلمانوں کو کچھ فائدہ تو نہیں پہنچایا۔ البتہ ان کی بربادی میں مزید اضافہ کر دیا۔

۲۴ فروری ۱۹۹۱

ٹائم میگزین (۴ فروری) میں ایک رپورٹ چھپی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں کچھ لوگ ہیں جو خلیج کی جنگ میں شریک ہونا نہیں چاہتے۔ افریقی امریکن (سیاہ فام) جو سفید فام نسل سے نفرت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ یہ سفید فام لوگوں کی برتری قائم کرنے کی جنگ ہے۔ اس لئے ہم کو اس میں شریک نہیں کیا جانا چاہئے (صفحہ ۳۹) یہی معاملہ امریکی مسلمانوں کا ہے۔ ان کے نزدیک امریکہ ایک اسلام دشمن ملک ہے۔ وہ موجودہ جنگ کو کافر اور مسلم کی جنگ سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی جنگ میں شرکت کے خلاف ہیں (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ فروری، صفحہ ۶)

ٹائم (۲۵ فروری) میں کوریا کے ایک شہری ڈیوڈ اسکاٹ (David E. Scott) کا خط اس کے جواب میں چھپا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امریکی شہریت اختیار کرنے کے بعد کسی شخص کے لئے ایسا کہنا درست نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ میرا ایک لڑکا امریکی ہے۔ یہ واقعہ کہ وہ کوریا میں پیدا ہوا تھا، اس سے اس کی یہ ذمہ داری ختم نہیں ہوتی کہ وہ اس ملک کا دفاع کرے۔ اگر آپ فائدوں کو قبول کریں تو آپ کو ذمہ داریوں کو بھی قبول کرنا ہوگا:

> My son is an American. The fact that he was born Korean does not in any way diminish his responsibility to defend this country. If you accept the benefits you must also accept the responsibilities (p. 8)

میں سمجھتا ہوں کہ کوریا کے مراسلہ نگار نے جو بات کہی ہے وہ عین درست ہے۔ جب آپ ایک ملک کے شہری بنیں اور اس کی مطلق وفاداری اور اس کے دفاع کا عہد کریں تو آپ کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ خارجی وفاداریوں کو ترک کر کے صرف اس کے وفادار بنیں اور بوقتِ ضرورت اس کی طرف سے لڑیں۔ کسی شخص کو یہ حق تو ہے کہ وہ ایسے ملک سے اپنی شہریت کو ختم کر دے اور وہاں سے ہجرت کر جائے مگر شہری رہتے ہوئے ایسا کرنا درست نہیں۔

یہ نہایت سطحیت اور گراوٹ کی بات ہے کہ آدمی فائدہ کو تو لے لے، مگر وہ ذمہ داریوں کو لینے کے لئے تیار نہ ہو۔ ذمہ داریوں کو اٹھانا ہی وہ قیمت ہے جس سے فائدوں کو لینے کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ذمہ داریوں کو اٹھانے سے انکار کرے تو فائدوں کو لینے کے لئے بھی اس کا استحقاق ختم ہو جائے گا۔

۲۵ فروری ۱۹۹۱

ریڈرس ڈائجسٹ (فروری ۱۹۹۱) نے چھ صفحہ کی ایک رپورٹ چھاپی ہے اس کے لکھنے والے مسٹر فلک (Rachel Flick) ہیں۔ اس میں تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ مغرب نے کس طرح صدام حسین کو بیوقوف بناکر عراق کی دولت کو لوٹا۔ عراق کا تیل اور اس کی ۴۵ بلین ڈالر کی سالانہ آمدنی کا بیشتر حصہ مغربی ملکوں کو پہنچتا رہا۔ پچھلے ۲۰ سال سے عراق بیرونی فوجی ہتھیاروں کی خریداری پر ۱۴ ہزار بلین ڈالر سالانہ خرچ کرتا رہا ہے۔ مغربی ٹھیکہ داروں کے ذریعہ صدام حسین نے اپنی ایر فورس کے لئے بے شمار نہایت مہنگے انڈر گراؤنڈ بیس تیار کرائے۔ وغیرہ

صدام حسین کو عرب لیڈر بننے کا جنون تھا۔ اس جنون کو مغرب نے استعمال کیا۔ اس نے عراق سے سستا تیل خریدا اور اس کو نہایت مہنگے ہتھیار فروخت کئے۔ اس طرح یہ خود مغرب ہے جس نے صدام حسین کو اپنے تجارتی اغراض کے لئے مسلح کیا۔ اسی کے ساتھ اس کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا۔ مغرب یہ سمجھتا تھا کہ عراق اپنی فوجی طاقت کو ایران کے خلاف استعمال کرے گا، وہ اس کے دشمن کے خلاف ہتھیار ثابت ہوگا۔

مگر صدام حسین کو اپنے ڈکٹیٹرانہ مزاج کی وجہ سے حقائق کی بالکل خبر نہ تھی۔ انھوں نے ایران پر حملہ اور کویت پر حملہ کے فرق کو نہیں سمجھا۔ ایران پر حملہ مغرب کو عین مطلوب تھا مگر کویت پر حملہ مغرب کے لئے عین غیر مطلوب تھا، کویت پر حملہ کر کے صدام حسین نے خود مغرب کے مفاد پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ سارے مغرب نے متحدہ طور پر طے کیا کہ صدام حسین کو کچل دیا جائے۔

مذکورہ مضمون میں لندن کے پروفیسر کوپٹز (Hans-Heino Kopietz) کا تبصرہ نقل کیا گیا ہے انھوں نے کہا کہ ہم نے (مغربی حکومتوں نے) اس معاملہ میں اپنی آنکھیں بند کرلیں اس لئے کہ اس سے ہم کو تجارتی فائدہ تھا۔ اور اس لئے کہ صدام ایران کے خلاف ہمارے لئے ایک مفید حربہ تھے۔ صدام ایک ایسا عفریت ہے جس کو خود مغرب نے پیدا کیا:

> We closed our eyes because some business wanted to make money and because Saddam was a useful tool against Iran. Saddam is a Frankenstein monster that the West created. (150)

صدام اگر قومی تعمیر کا منصوبہ بناتے۔ وہ مغرب کے ذریعہ اپنی زراعت اور صنعت کو ترقی دیتے۔ وہ لوگوں کو تعلیم یافتہ بناتے تو عراق کا مستقبل اس سے مختلف ہوتا جو آج وہاں دکھائی دے رہا ہے۔

۲۶ فروری ۱۹۹۱ء

قومی آواز (۲۶ فروری) میں خلیج کی جنگ کے مابعد اثرات کے بارہ میں ایک جائزہ شائع ہوا ہے۔ اس کا ایک پیراگراف یہ ہے: نئی دہلی کے ایک سعودی ڈپلومیٹ نے اس نامہ نگار سے گفتگو کے دوران عالمی مسلم رائے عامہ میں تبدیلی پر انتہائی برگشتگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جنگ کے خاتمہ پر سعودی عرب دنیا کی مختلف سرکردہ مسلم جماعتوں اور تنظیموں کے متعلق اپنی پالیسی پر نظرثانی کرے گا۔ کیوں کہ یہ تمام جماعتیں اور تنظیمیں سعودی موقف کے حق میں عوامی حمایت حاصل کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں (صفحہ ۷)

سعودی عرب نے تمام دنیا کی مسلم جماعتوں کو غیر معمولی مالی امداد دی۔ مگر خلیج کے بحران کے زمانہ میں تقریباً ہر ملک کے مسلم عوام سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کے حامی بن گئے۔ حالانکہ اس معاملہ میں سعودی عرب کی حیثیت دفاع کرنے والے کی تھی اور صدام حسین کی حیثیت جارح اور ظالم کی۔ اس کی وجہ مسلم رہنماؤں کی جذباتی سیاست ہے۔ ان رہنماؤں کا مفاد اس میں تھا کہ وہ عوام کی بھیڑ جمع کریں تاکہ عرب ملکوں کی نظر میں ان کی یہ حیثیت قائم ہو کہ مسلم عوام ان کے ساتھ ہیں۔ مسلم رہنماؤں کا یہ قیادتی تقاضا انھیں اس طرف لے گیا کہ وہ جذباتی نعروں کا استعمال کریں۔ کیوں کہ عوام کی بھیڑ صرف جذباتی نعروں پر ہی جمع کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فلسطین کے اشو کو خوب بڑھا چڑھا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ زبان وقلم کی ساری طاقت یہ ثابت کرنے پر لگادی کہ امریکہ سب سے بڑا اسلام دشمن ہے۔

اس طرح مسلمانوں کے جذبات اسرائیل کے بارہ میں اور امریکہ کے بارہ میں شدت کے ساتھ بھڑک اٹھے۔ وہ اس معاملہ میں آخری حد تک حساس ہو گئے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صدام حسین سب سے بڑے دشمنِ اسلام (امریکہ) کو چیلنج کر رہا ہے۔ وہ ظالم اسرائیل پر اسکڈ میزائل مار رہا ہے۔ اور اسرائیل کے سرپرستوں سے کہہ رہا ہے کہ ہوش میں آجاؤ۔ کیوں کہ سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ صدام حسین کے یہ الفاظ مسلمانوں کی موجودہ نفسیات کے اعتبار سے بالکل جادو ثابت ہوئے۔ انھیں دکھائی دیا کہ سعودی عرب اسلام کے دشمن نمبر ایک کا ساتھ دے رہا ہے اور صدام حسین اسلام کے دشمن نمبر ایک کو سمندر میں غرق کرنے کا نعرہ لگا رہا ہے، تو وہ اپنی مذکورہ نفسیات کی بنا پر سعودی عرب کو چھوڑ کر صدام حسین کی طرف دوڑ پڑے ــــــ کسی مسئلہ پر قوم کو غیر متناسب حد تک حساس بنانا شخصی قیادت کے لئے بہت کارآمد ہے۔ مگر خود قوم کے لئے وہ تباہ کن حد تک غیر مفید ہے۔

۲۷ فروری ۱۹۹۱

المجلۃ (۲۷ فروری ۱۹۹۱) میں دکتور علی الدین ہلال (مدیر مرکز الدراسات السیاسیۃ بجامعۃ القاہرۃ) کا مضمون چھپا ہے۔ یہ خلیجی بحران کے اسباب کے بارہ میں ہے۔ اس کا عنوان ہے: فلنتدبر الاسباب ونحن فی قلب العاصفۃ۔

وہ لکھتے ہیں کہ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم معاملات کو محض ان کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ اور جڑ کی اور گہرائی کی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ ہم سب کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس عقل سے مسلح کریں جو ہم کو اس قابل بنائے کہ ہم خلیج اور اس کی قوموں کے مسائل کا مقابلہ زیادہ گہرے انداز میں کر سکیں (اننا ناخذ الامور عادۃ بمظاھرھا ولا نبحث فی الجذور والاعماق...... والمطلوب منا جمیعا ان نتسلح بالعقل الذی یمکننا من مواجھۃ مشاکل المنطقۃ وشعوبھا بشکل جوھری وجذری (صفحہ ۲۳)

اصولاً یہ بات نہایت اہم ہے۔ مگر موجودہ شکل میں وہ بالکل بے فائدہ ہے۔ قوم کے اندر مطلوبہ عقل پیدا کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ تنقید کی کھلی آزادی ہو۔ تنقید سے میری مراد المجلہ کے مذکورہ مضمون جیسی عمومی تنقید نہیں بلکہ متعین اور مشخص تنقید ہے۔ اور موجودہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض چیز یہی تنقید ہے۔ جب تک متعین اور مشخص تنقید کے بارہ میں مسلمانوں کی غیر ضروری حساسیت کو ختم نہ کیا جائے، ان کے اندر عقلی بالیدگی پیدا ہونا ممکن نہیں۔

مثال کے طور پر خلیج کے معاملہ کو لیجئے۔ اس کی جڑ یہ ہے کہ آج پوری مسلم دنیا میں یہ مزاج بن گیا ہے کہ ظالمانہ کارروائی کی زد غیر پر پڑے تو اس کی مذمت نہیں کی جاتی۔ کسی ظالمانہ کارروائی کی مذمت صرف اس وقت کی جاتی ہے جب کہ اس کی زد خود اپنے آپ پر پڑ رہی ہو۔ صدام حسین نے ۷ ستمبر ۱۹۸۰ کو ایران پر بمباری کی تو عرب حلقہ نے اس کی مذمت نہیں کی۔ اسی صدام نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو کویت پر حملہ کیا تو پورا عرب حلقہ چیخ اٹھا۔ یہ مزاج برائی کی جڑ ہے۔ لیکن اگر اس برائی کی کھلی نشاندہی کی جائے تو مقدس ترین لوگ بھی اس کو سننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

اس مزاج کو باقی رکھتے ہوئے تسلح بالعقل کی بات کرنا محض ایک خوش خیالی ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

۲۸ فروری ۱۹۹۱

ٹائم میگزین کا شمارہ جس میں ۴ مارچ ۱۹۹۱ کی تاریخ چھپی ہوئی ہے، وہ پیشگی طور پر مجھے آج ملا۔ اس شمارہ میں حکومت روس کے ایڈوائزر پرائماکوف (Yevgeni Primakov) کی ایک تازہ تحریر شائع ہوئی ہے جو صدام حسین اور خلیج کے مسئلہ سے متعلق ہے۔

مسٹر پرائماکوف لکھتے ہیں کہ میں صدام حسین سے بار بار ملا ہوں۔ سب سے پہلے صدام حسین سے میری ملاقات ۱۹۶۹ میں ہوئی جب کہ میں پراودا کا کرسپانڈنٹ تھا۔ اس وقت صدام حسین بعث پارٹی کے لیڈر تھے، مگر ابھی وہ عراق کے صدر نہیں بنے تھے۔ صدام حسین کے صدر بننے کے بعد ان سے میری بار بار ملاقاتیں ہوئیں، بغداد میں بھی اور ماسکو میں بھی۔ حتی کہ میرے اور ان کے درمیان بے تکلفانہ تعلقات ہوگئے، فروری ۱۹۹۱ میں وہ میخائل گورباچوف کے نمائندہ کی حیثیت سے کئی بار صدام حسین سے ملے اور عراقی صدر کو کویت سے اپنی فوجیں واپس کرنے کے معاملہ میں بات کی۔

مسٹر پرائماکوف کہتے ہیں کہ صدام حسین سے قریبی تعلق کے بعد میں نے جانا کہ صدام حسین کو پوری بات سے واقفیت نہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے موافق رپورٹوں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں، مثال کے طور پر، عرب دنیا میں عراق کی حمایت کے بارہ میں، مغرب میں جنگ کے مخالف مظاہروں کے بارہ میں، عراق کے خلاف اتحادی ملکوں میں اندرونی اختلاف کے بارہ میں۔ اور جہاں تک بری خبروں کا تعلق ہے تو ایسی خبر لانے والے کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے:

> I realized that it was possible Saddam did not have complete information. He gave priority to positive reports: for example, about the support Iraq was receiving in the Arab World, about the antiwar demonstrations in the West, about the first hints of differences between the allies in the anti-Iraqi coalition. And as for bad news, the bearer could pay a high price.

یہی کمزوری تمام مسلم رہنماؤں میں پائی جاتی ہے، حتی کہ مسلمانوں کے مقدس اکابر میں بھی۔ یہ لوگ اپنے فرضی تخیلات میں گم رہتے ہیں۔ ان کو ایسے ہی افراد پسند آتے ہیں جو ان کے مفروضات کی تصدیق کریں۔ جو شخص ان سے اختلافی بات کرے وہ ان کی نظر میں فوراً مبغوض ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ حقیقت حال سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ وہ ایسے غیر پختہ اقدامات کرتے ہیں جن کا نتیجہ بربادی کے سوا کسی اور صورت میں نکلنے والا نہ ہو۔

یکم مارچ ۱۹۹۱

خلیج کی جنگ احمقانہ اقدام پر شروع ہوئی اور آخر کار بدترین شکست پر ختم ہوگئی۔ آج کے اخبارات عبرتناک خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا (یکم مارچ) نے نہایت جلی حرفوں میں اپنے پہلے صفحہ پر یہ سرخی قائم کی ہے کہ خلیج کی جنگ ختم (Gulf war ends) اس کے ساتھ سات کالمی تصویر ہے جس میں عراق کے جنگی قیدی بڑی تعداد میں ٹرکوں میں بھرے ہوئے ہیں اور امریکی سپاہی ان کو مخصوص کیمپوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ یہ تصویر اس بات کا اعلان ہے کہ یہ شکست بھی تھی اور اسی کے ساتھ ذلت اور رسوائی بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ میں "رسواکن شکست" کا اتنا بڑا واقعہ اس سے پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو ۵۸۶ ق م میں بنی اسرائیل کے اوپر بنوکد نضر (Nebuchadrezzar II) کے ہاتھوں گزرا تھا۔ اس کا ذکر قرآن (بنی اسرائیل ۵) میں مختصر طور پر اور بائبل میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اس سلسلہ میں بائبل کی کتاب یرمیاہ کا مطالعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔

امریکہ کے زیر قیادت اتحادیوں کے طاقتور جہازوں نے رات دن بمباری کرکے عراق کی اقتصادیات کو تباہ کر دیا۔ عراق کی زمین کے نیچے دنیا کے تیل کے ذخیرہ کا دس فی صد موجود ہے۔ تیل کے ذریعہ اس کی آمدنی ۴۵ بلین ڈالر سالانہ تھی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ عراق کے شہروں میں لوگ سڑکوں پر ٹوٹی پھوٹی چیزیں جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں تاکہ اس سے اپنے چولہے کو جلائیں۔ عراق کو تباہ کرنے کے بعد اتحادی فوجوں نے عراق اور کویت کے درمیان سپلائی لائن کاٹ دی۔ کویت میں مقیم عراقی فوج بالکل بے سہارا ہوگئی اور صرف دو دن کی زمینی کارروائی میں ہتھیار ڈال کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک لاکھ سے زیادہ فوجی مارے گئے۔ ۳۰ ہزار قیدی بنائے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روایتی ہتھیاروں اور "ہائی ٹیک" کے درمیان مقابلہ تھا جس میں روایتی ہتھیاروں کو لازماً شکست کھانا تھا۔

جنگ میں تمام دنیا کے مسلمان صدام کے حامی بن گئے تھے۔ اس اعتبار سے صدام کی شکست ساری دنیا کے مسلمانوں کی شکست ہے۔ عراقی لیڈروں نے اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے اس نادانی کے ذریعہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں رسوا کر لیا ہے۔ اس واقعہ پر یہ حدیث صادق آتی ہے کہ: کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ پوچھا گیا کہ کوئی شخص خود اپنے کو کیوں کر ذلیل کرے گا۔ فرمایا کہ وہ ایسے فتنہ کا سامنا کرے جس سے نپٹنے کی طاقت اس کے اندر نہ ہو (مشکاۃ المصابیح ۲/۱۷۷)

روشن امکانات

آئرلینڈ کے ایک شہر (Athlone) سے ایک ماہانہ انگریزی پرچہ نکلتا ہے جس کا نام مسلم ویوز (Muslim Views) ہے۔ اس کے شمارہ مارچ ۱۹۹۱ میں ایک نومسلم مسٹر شفیق مارٹن (Shafiq Morton) کا مضمون خلیج کی جنگ کے بارہ میں چھپا ہے۔ اس میں انھوں نے امریکی صدر جارج بش کی حکومت کے اس نظریہ کا ذکر کیا ہے کہ خلیج میں امریکہ کی کامیابی نے اس کے لئے علاقہ میں مواقع کی ایک کھڑکی کھول دی ہے :

The Bush administration believes its success in the Gulf has given it a window of opportunity in the area.

مسٹر شفیق مارٹن کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خلیج کی جنگ کے بعد مواقع کی جو کھڑکی کھلی ہے، اسے مسلمانوں کو استعمال کرنا چاہئے نہ کہ امریکہ کو:

Muslims not the US must use the window.

خلیج کی جنگ بلاشبہ ایک دردناک المیہ تھی۔ مگر اس دنیا میں "زوجین" کا تخلیقی اصول کارفرما ہے (الذاریات ۴۹)۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ اس کا ضد بھی ضرور موجود رہتا ہے۔ یہ اصول اتنا عام ہے کہ اس دنیا کی کوئی بھی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں، خواہ وہ حیوانات کا معاملہ ہو یا جمادات اور نباتات کا۔ حتی کہ معانی اور حقائق بھی اس دنیا میں ہمیشہ جوڑے کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔

عسر کا جوڑا یسر ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ یہاں ہمیشہ عسر (مشکل) کے ساتھ یسر (آسانی) بھی لازماً موجود رہے۔ اس دنیا میں کسی کے لئے جب ایک ڈس ایڈوانٹج پیدا ہو تو وہ ایک ایڈوانٹج بھی اپنے ساتھ ضرور لے آئے۔ چنانچہ یہاں بھی منفی پہلو کے ساتھ مثبت پہلو موجود ہے۔

تعمیری پہلو

خلیج کی جنگ شروع ہوئی تو ۱۸ جنوری ۱۹۹۱ کو عراق نے اسرائیل کے اوپر ایک اسکڈ (Scud) مارا جس کا نام صدام حسین نے حجارۃ السجیل رکھا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے تقریباً ڈیڑھ مہینہ کے اندر ۳۵ اسکڈ اسرائیل کے مختلف نشانوں پر پھینکے۔

یہ صدام حسین کی نہایت گہری تدبیر تھی ۔ صدام حسین کا خیال تھا کہ اسرائیل کی زمین پر عراقی اسکڈ گرتے ہی اسرائیل اپنے معروف مزاج کے مطابق بپھر اٹھے گا اور فوراً عراق کے اوپر جوابی حملہ کرے گا ۔ اس طرح یہ جنگ عراق ۔ امریکہ جنگ نہ رہے گی بلکہ عرب ۔ اسرائیل جنگ بن جائے گی اور پھر تمام عرب اور تمام دنیا کے مسلمان عراق کے ساتھی بن جائیں گے ۔

مگر جو شخص اپنے کو ہوشیار اور دشمن کو بے وقوف سمجھے ، وہ خود سب سے بڑا بیوقوف ہے ۔ چنانچہ اسرائیل نے امریکہ کے مشورہ پر اس معاملے میں جوابی حملہ کے بجائے جوابی ہوشیاری کا طریقہ اختیار کیا ۔ یہ طریقہ ضبط (restraint) تھا ۔ وہ بار بار عراقی اسکڈ کا شکار ہوتا رہا ۔ مگر اس نے نہ صرف یہ کہ کوئی جوابی کارروائی نہیں کی بلکہ عراقی حملہ اور اس کے نقصانات کے اعلان و اظہار سے بھی مکمل پرہیز کیا ۔

ضبط کی اس پالیسی کا نتیجہ اسرائیل کو نہایت شاندار ملا ۔ خلیج کی جنگ عرب ۔ اسرائیل جنگ نہ بن سکی ۔ نقصان کی تلافی کے نام پر عراق کے ہر اسکڈ پر اسرائیل کا ایک بلین ڈالر کا بل بنتا رہا جس کو امریکہ نے بلا تاخیر اسے ادا کر دیا ۔ مزید یہ کہ امریکہ کی کامیاب فوجی کارروائی نے فلسطینی تحریک کو اس انجام تک پہنچا دیا جس کا اندیشہ ایک مبصر نے ان لفظوں میں ظاہر کیا تھا :

> It seems that the Palestinian question will be one of the principal casualties of Desert Storm.

عراق کی طرف سے اسکڈ میزائل کے مسلسل حملے اسرائیل کے لئے انتہائی اشتعال انگیز تھے ۔ مگر اسرائیل نے کسی بھی قسم کی کوئی جوابی کارروائی نہیں کی ۔ اس نے اس معاملہ کو چھپایا اور آخری حد تک ضبط و تحمل سے کام لیا ۔ اسی کا نام حقیقت پسندانہ سیاست ہے ۔ یہ حقیقت پسندانہ سیاست موجودہ مسلمانوں میں معدومیت کے درجہ میں ختم ہو گئی تھی ۔ خلیج کی جنگ میں ایک دشمن کے ذریعہ اس طریق عمل کا کامیاب مظاہرہ کر کے مسلمانوں کو یہ بتایا گیا کہ اس طرح کے معاملات میں نتیجہ خیز عمل کا طریقہ کیا ہے ۔ اور یہ کہ مسلمانوں کو اپنی سیاست کس ڈھنگ پر چلانا چاہئے ۔ خلیج کا یہ واقعہ اس معاملہ میں ایک چشم کشا واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔

راقم الحروف کا اندازہ ہے کہ یہ جنگ مسلمانوں کے لئے مہمیز ثابت ہوئی ہے اور انھوں نے اس

سے نہایت گہرے طور پر حقیقت پسندی کا سبق لیا ہے۔ ان کے اندر واضح طور پر سیاست کا نیا انداز ابھرتا ہوا نظر آرہا ہے۔ "دوست" کی بات ان کی آنکھ کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی، مگر "دشمن" کے عمل نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ اب یقینی ہے کہ بیسویں صدی کا خاتمہ مسلمانوں کی بے فائدہ جذباتی سیاست کا خاتمہ ثابت ہوگا۔ اکیسویں صدی میں وہ ازسرنو ایک حقیقت پسند قوم بن کر داخل ہوں گے اور انشاء اللہ اسلام کی نئی تاریخ بنائیں گے۔

خلیج کے تخریبی واقعہ میں یہ تعمیری پہلو واضح طور پر دکھائی دے رہا ہے۔ اس نے مسلمانوں کے جذباتی انداز فکر پر روک لگائی ہے اور ان کے اندر حقیقت پسندانہ طرز فکر ابھارا ہے۔ وہ اس بات کو سمجھنے لگے ہیں کہ بڑے بڑے الفاظ بولنا کوئی کام نہیں۔ اصل کام عمل ہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ وہ اس راز کو جان رہے ہیں کہ اقدام وہ ہے جو تیاری کے بعد کیا جائے۔ تیاری کے بغیر کیا ہوا اقدام خودکشی کی چھلانگ ہے نہ کہ کوئی حقیقی اقدام۔ وہ زندگی کی اس حقیقت سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو گئے ہیں کہ طاقت دراصل داخلی استحکام کا نام ہے۔ کوئی بھی خارجی چیز داخلی کمی کی تلافی نہیں بن سکتی۔

اب تک مسلمان صرف بولنے کو کام سمجھے ہوئے تھے، اب انھوں نے جانا کہ بہت سے مواقع پر نہ بولنا ہی زیادہ بڑا کام ہوتا ہے۔ وہ ہر عمل کے بعد جوابی عمل کرنے کو ضروری خیال کئے ہوئے تھے، اب انھوں نے یہ دریافت کیا کہ اکثر اوقات فریق ثانی کے عمل کے باوجود جوابی عمل نہ کرنا زیادہ موثر کارروائی ہوتا ہے۔ اب تک وہ اس وہم میں پڑے ہوئے تھے کہ جب کسی کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جائے تو اس کے بعد ہمارا مشتعل ہو جانا عین فطری ہے، مگر خلیج کے تجربہ سے انھوں نے یہ سیکھا ہے کہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونا زیادہ کامیاب اقدام ہے۔

مسلمان اب تک اس غلط فہمی میں تھے کہ اگر طاقت ہو تو اس کو استعمال کرنا بھی ضروری ہے، اب انھوں نے جانا کہ استعمال طاقت سے بھی زیادہ بڑی چیز مظاہرۂ طاقت ہے۔ اب تک وہ یقین کئے ہوئے تھے کہ ہر موقع پر لڑ جانے کا نام جہاد ہے۔ اب انھوں نے جانا کہ سب سے پہلا جہاد قوم کو تیار کرنا ہے۔ ضروری تیاری کے بغیر قوم کو جنگ میں الجھانا جہاد نہیں ہے بلکہ فساد ہے جس کا کوئی نتیجہ اسباب کی اس دنیا میں نکلنے والا نہیں۔

دعوتی پہلو

دوسرا زیادہ اہم اور دوررس فائدہ وہ ہے جو دعوتی مواقع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس جنگ کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ مغربی لوگوں کا تعلق اہل اسلام سے بہت بڑے پیمانے پر قائم ہوا۔ پانچ لاکھ سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ امریکہ اور یورپ سے نکل کر خلیج میں اکٹھا ہوگئے۔ ان کا سابقہ مختلف پہلوؤں سے مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا۔ اس کے ذریعہ دعوت اسلامی کے نئے مواقع کھلے۔

آسٹریا کے نومسلم لیوپولڈ اسد ۱۹۲۲ میں اخباری کرسپانڈنٹ کی حیثیت سے مسلم مشرقی ملکوں میں گئے۔ وہاں وہ اتنا متاثر ہوئے کہ کچھ دنوں بعد انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے اپنی کتاب روڈ ٹو مکہ میں لکھا ہے کہ جس چیز نے مجھے سب سے پہلے سوچنے پر مجبور کیا، وہ مغربی قوموں اور مسلمانوں کے طریق زندگی کا فرق (difference) تھا۔ یہاں سے ان کے فکر کا آغاز ہوا جو بعد کو اسلام کے مطالعہ میں تبدیل ہوگیا۔ اور اس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔

یہی واقعہ خلیج میں امریکہ اور یورپ کی فوجوں کی آمد کا ہوا ہے۔ انھوں نے یہاں اپنے ملک کی زندگی اور مسلمانوں کی زندگی میں جو "فرق" دیکھا، اس نے انھیں غور وفکر کرنے پر مجبور کیا۔ بہت سے لوگ اسلام سے متاثر ہوئے اور ان کی ایک تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔ سعودی اخبارات کی اطلاع کے مطابق، دسمبر ۱۹۹۰ کے آخر تک خلیج میں آنے والے تقریباً ڈیڑھ سو امریکیوں نے اسلام قبول کر لیا تھا (قومی آواز ۷ جنوری ۱۹۹۱)

مختلف اطلاعات بتاتی ہیں کہ حال میں امریکہ میں اسلام کے مطالعہ کا رجحان کافی بڑھا ہے۔ ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی نے بتایا کہ وہ شکاگو گئے۔ وہاں کتابوں کی ایک بڑی دکان میں جانے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے دکان والوں سے پوچھا کہ آپ کے یہاں سلمان رشدی کی کتاب "دی سیٹنک ورسز" کی فروخت کیسی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج اس کی تین کتاب فروخت ہوئی ہے۔ پھر انھوں نے دکان دار سے پوچھا کہ آج قرآن کا ترجمہ کتنا فروخت ہوا۔ دکان دار نے بتایا کہ آج کی تاریخ میں صرف ہمارے یہاں سے انگریزی ترجمہ قرآن کے ۵۰ نسخے فروخت ہوئے ہیں۔

یہی حال یورپ کا بھی ہے۔ موجودہ حالات نے اسلام کو اور مسلمانوں کو اخبار اور ریڈیو اور ٹی وی کی خبروں میں نمایاں کیا۔ ہر طرف مسلم معاملات کا چرچا ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام

کے بارہ میں واقفیت حاصل کرنے کے رجحان میں بھی تیزی سے اضافہ ہوگیا۔ مثال کے طور پر راقم الحروف کے پاس مغربی جرمنی سے ایک خط آیا ہے۔ مکتوب نگار مسز عزالہ جنگ نے لکھا ہے کہ آجکل یورپ میں اسلام کے مطالعہ میں دلچسپی بہت بڑھی ہے۔ اور "گاڈ ارائزز" اور "محمد دی پرافٹ آف ریولیوشن" کی جو کاپیاں میرے پاس ہیں، ان کی مانگ میں بہت اضافہ ہوگیا ہے:

These days there is so much interest in Islam and my copies of *God Arises* and *Muhammad the Prophet of Revolution* are in great demand.

مغرب کے فوجیوں کے درمیان اسلام کے بارہ میں جو تجسس پیدا ہوا، اسی کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ خود امریکی حکومت نے اس کا اہتمام کیا کہ وہ اسلام کے بارہ میں بنیادی معلومات مرتب کرکے اپنے فوجیوں تک پہنچائے۔

نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۰ میں میں ایک سفر کے تحت امریکہ میں تھا۔ ۴ دسمبر کا واقعہ ہے۔ میں لاس اینجلیز کے اسلامک سنٹر میں تھا۔ اس دوران کچھ سفید فام امریکی مرکز میں آئے۔ معلوم ہوا کہ یہ امریکی فوج کے ریڈیو اینڈ ٹیلی وزن براڈ کاسٹنگ سنٹر کے افراد ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک سوسائٹی آرنج کاونٹی) سے ملاقات کی۔ اور ویڈیو کیسٹ تیار کرنے کے ایک پروگرام کے بارہ میں ان سے گفتگو کی۔

معلوم ہوا کہ امریکی فوج کے منصوبہ کے تحت ایک ویڈیو فلم تیار کی جارہی ہے۔ اس کا عنوان ہوگا "اسلام کیا ہے"۔ اس میں کسی کمی یا اضافہ کے بغیر اسلام کا تعارف کرایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کا انتخاب کیا ہے جو باقاعدہ عالم اور پختہ مسلمان ہیں۔

امریکی عملہ کے ایک ممبر نے گفتگو کے دوران کہا کہ خلیج میں امریکی فوجوں کی موجودگی سے ایک اچھی چیز یہ برآمد ہوئی ہے کہ بہت سے امریکی اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں:

The one good thing that came out of this armed forces presence in the Gulf is that many people are now interested to know more about Islam and Muslim people.

اسلام کی پوری تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی دوسری قوموں کا اختلاط مسلمانوں سے پیش آیا ہے

وہ مسلمانوں سے اور اسلام سے ضرور متاثر ہوئے ہیں۔ خواہ وہ بظاہر دشمن ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی ایک واضح مثال تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کا مسلمانوں سے اختلاط کا واقعہ ہے۔ تاتاری اگرچہ جارح اور دشمن تھے، مگر جب ان کا مسلمانوں سے قریبی اختلاط ہوا تو اسلام نے انھیں مسخر کر لیا اور ان کی بڑی تعداد اسلام کے حلقہ میں داخل ہوگئی۔ اسلام کے دشمن اسلام کے دوست بن گئے۔

امریکیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ کھلے ذہن کے ہوتے ہیں۔ کوئی بات ان سے کہی جائے تو عام طور پر وہ اس کو غور سے سنتے ہیں اور غیر متعصبانہ ذہن کے تحت اس کے بارہ میں اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات میں نے پڑھے ہیں۔ نیز کئی واقعات خود میرے ذاتی علم میں آئے ہیں۔

ایک واقعہ وہ ہے جو ۵ دسمبر ۱۹۹۱ کی شام کو امریکہ میں قیام کے دوران پیش آیا۔ اس روز اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی (کیلی فورنیا) کے ہال میں ایک اجتماع تھا۔ پورا ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ یہ یہودی، مسیحی، مسلم سینار (Trialogue) تھا۔ سینار کی تکمیل پر خاتمہ کا کلمہ مجھے کہنا تھا۔ تینوں مذہب کے تین بنیادی مقرر حسب ذیل تھے :

1. Rabbi Dr David Gordis,
   President, University of Judaisa, L.A.
2. Rev. Dr George Grose,
   President, Academy for Judaic, Christian & Islamic Studies, L.B.
3. Imam Dr Muzzammil H. Siddiqi,
   Director, Islamic Society of Orange County, C.A.

پہلے یہودی عالم نے تقریر کی اور اپنے مذہب کی تعلیمات کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد عیسائی عالم کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے مذہب کے بارہ میں تفصیل سے بتایا۔ آخر میں ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی (ڈائرکٹر اسلامک سوسائٹی آرنج کاؤنٹی) کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اسلام کا تعارف پیش کیا۔

ڈاکٹر مزمل حسین صدیقی کی تقریر اسی طرح بقیہ دونوں تقریروں پر بھاری ہوگئی جس طرح اسلام دوسرے مذاہب پر بھاری ہے۔ میرے قریب کی سیٹوں پر چند امریکی نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ تقابلی مذہب (comparative religion) کے طلبہ تھے۔ وہ اگرچہ مسیحی تھے اور امریکہ کی سفید فام نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر کو سننے کے بعد ایک نوجوان نے اپنے امریکی ساتھیوں سے کہا کہ میں

مسیحی ہوں۔ مگر ڈاکٹر صدیقی کی تقریر نے مجھے اپنے عقیدہ کے بارے میں شک میں ڈال دیا ہے اور میں دو بارہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مجھے اسلام کے بارہ میں اور زیادہ جاننے کی ضرورت ہے۔ وہ واقعۃً غیر معمولی قسم کے لائق آدمی ہیں:

I am a Christian. But Dr Siddiqi's presentation makes me think twice. I have to learn more about Islam. He was terrific real genius.

حل یہاں ہے

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ عالم اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ اسرائیل ہے۔ ۱۹۴۸ کے جہاد فلسطین سے لے کر ۱۹۹۱ کی جنگ خلیج تک سیکڑوں چھوٹے بڑے ٹکراؤ اس مسئلہ کے نام پر ہو چکے ہیں۔ مگر ۵۰ سالہ کوششوں کے باوجود اصل مسئلہ ایک فیصد بھی حل نہ ہو سکا۔ بلکہ دن بدن اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اس معاملہ میں جہاد و قتال کا طریقہ بہت زیادہ آزمایا جا چکا ہے۔ اب میں کہوں گا کہ مسلمان اس معاملہ کو حل کرنے کے لئے وہ طریقہ اختیار کریں جس کو دعوت کا طریقہ کہا جاتا ہے۔

یہاں میں ایک حدیث یاد دلانا چاہتا ہوں۔ مکی دور کے آخر میں جب کہ اسلام کے لئے بظاہر نہایت مشکل حالات ہو چکے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: امرت بقرية تأكل القرىٰ يقولون يثرب وهي المدينة (مجھے ایک بستی کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ بستی تمام دوسری بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں، اور وہ مدینہ ہے)

یہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جانے کی طرف اشارہ تھا۔ مگر ہجرت محض ترک وطن کا نام نہیں ہے۔ ہجرت دراصل تبدیلیٔ عمل کا نام ہے۔ یعنی مشن کو آگے بڑھانے کے لئے جب ایک مقام پر عمل کرنا موثر نہ ہو رہا ہو تو دوسرے مقام پر عمل شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق مکہ کو چھوڑ دیا، اور مدینہ کو اپنا مرکز عمل بنایا۔ جیسا کہ معلوم ہے، اس کے جلد ہی بعد وہ حالات پیدا ہوئے کہ مکہ پوری طرح مسخر ہو گیا۔

حدیث کی روشنی میں فلسطین کے مسئلہ پر سوچئے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس معاملہ میں امریکہ کو "قریہ" کی حیثیت حاصل ہے۔ اس حدیث کا پیغام یہ ہے کہ اگر "فلسطین" میں عمل کر کے تمہارا مسئلہ

حل نہیں ہورہا ہے تو اپنے عمل کا میدان " امریکہ " کو بنالو۔ یعنی فلسطین کی جغرافی جد وجہد کو امریکہ کی دعوتی جد وجہد میں تبدیل کردو۔ اسلام کے پر امن ربانی پیغام کو لے کر امریکہ میں داخل ہوجاؤ۔

حالات بتاتے ہیں کہ مسلمان اگر اس دعوتی کوشش کو صحیح انداز سے چلائیں تو انشاء اللہ وہی ہوگا جو مدینہ میں ہوا۔ یعنی امریکہ کے بیشتر گھروں میں اسلام داخل ہو جائے گا۔ اور اگر امریکہ کی قابل لحاظ آبادی اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائے تو گویا مسلمانوں کو فلسطین کے مسئلہ کے حل کی کنجی ہاتھ آگئی۔ عجب نہیں کہ اس کے بعد ایسا انقلابی نتیجہ سامنے آئے کہ کوئی کہنے والا کہہ پڑے ــــ فلسطین کا وہ راستہ زیادہ قریب ہے جو امریکہ ہو کر جاتا ہے۔

تاریخ کا اعادہ

بغداد، اسلام کی تاریخ میں، بیک وقت دو چیزوں کی علامت ہے۔ اہل اسلام کی سیاسی بربادی، اور پھر سیاسی بربادی کے کھنڈر سے دوبارہ اسلام کی نئی دینی تاریخ کا ظہور میں آنا۔

۱۳ ویں صدی عیسوی میں بغداد مسلم تہذیب کا عظیم مرکز تھا۔ ۱۲۵۸ء میں مغل سردار ہلاکو خاں طاقتور قبائلی فوج کے ساتھ بغداد میں داخل ہوا۔ اس نے خلیفہ المستعصم کو قتل کر دیا۔ اور وہاں کے ۸ لاکھ (800,000) باشندوں کو ہلاک کر ڈالا۔ مورخ ابن اثیر اس وقت زندہ تھا۔ اس نے عینی شہادت کے مطابق اپنی تاریخ میں ان واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ آدم کی پیدائش سے لے کر اب تک کے تمام حادثات میں یہ سب سے بڑا حادثہ تھا تو ایسا کہنا غلط نہ ہوگا۔

مگر اس حادثہ کے فوراً بعد یہ ہوا کہ دوبارہ اسلام کے موافق اسباب تاریخ میں کام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ۵۰ سال بعد حالات بالکل بدل گئے۔ تلوار کی طاقت سے فتح حاصل کرنے والے تاتاری اسلام کی فکری اور روحانی طاقت سے مفتوح ہو گئے۔ اور پھر دنیا نے دیکھا کہ جو لوگ اسلام کے دشمن سمجھے جارہے تھے، وہ اسلام کے خادم اور اس کے پاسبان بن گئے ہیں۔

1991ء میں دوبارہ بغداد کے ساتھ وہی معاملہ شدید تر شکل میں پیش آیا جو اس سے ۷۳۲ سال پہلے یہاں پیش آیا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک بے حد المناک حادثہ ہے۔ ایک معاصر مصنف نے موجودہ حادثہ کے پیچھے کام کرنے والی تحریکوں اور ان کے مخططات کی تفصیل بتاتے ہوئے اس کو عالم عرب کے اوپر سب سے بڑا خطرہ (اکبر خطر علی العالم العربی) بتایا ہے۔

مگر راقم الحروف کو اس کے برعکس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شر سے دوبارہ ایک خیر ظاہر ہوگا اور عجب نہیں کہ موجودہ خیر پہلے خیر سے زیادہ بڑا ہو جس طرح موجودہ شر پہلے شر سے زیادہ بڑا تھا۔

اس شر میں خیر کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ جدید مسلم قوموں میں پہلی بار یہ ذہن ابھر رہا ہے کہ اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے سیاسی طریقہ مفید نہیں۔ اس مقصد کے لئے صحیح اور مفید طریق کار وہ ہے جس کو دعوتی طریق کار کہا جاتا ہے۔ یعنی اسلام کی فکری اور نظریاتی قوت کو عمل میں لاکر اسلام کا احیاء کرنا۔ اسلام کی پرامن طاقتوں کو بروئے کار لانا۔

اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے۔ تبلیغ و دعوت ہی اس کی طاقت کا اصل راز ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر جو تحریکیں اٹھیں انھوں نے مخصوص اسباب کے تحت سیاسی رخ اختیار کرلیا۔ ان تحریکوں کی دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک وہ جو اسلامی سیاست اور اسلامی نفاذ کے نام پر اٹھیں اور دوسری وہ جنھوں نے سوشلزم اور عرب قومیت جیسے نعرے اختیار کر لئے۔ یہ دونوں قسم کی تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے مختلف تھیں مگر نتیجہ کے اعتبار سے دونوں کا حاصل ایک تھا۔ اسلامی تحریک اور اسلامی جدوجہد کا اصل انحصار عملیت دعوت (*dawah* activism) پر ہوتا ہے۔ مگر ان تحریکوں نے مسلمانوں کو بے فائدہ طور پر عملیت سیاسی (political activism) حتی کہ مزید تباہ کن طور پر عملیت عسکری (violent activism) میں مبتلا کر دیا۔

موجودہ زمانہ میں جو سائنسی انقلاب آیا ہے اس نے اسلام کی اشاعت کے لئے بے شمار نئے مواقع اور نئے امکانات کھول دئے تھے سب سے بڑا کرنے کا کام یہ تھا کہ ان دعوتی امکانات کو استعمال (avail) کیا جائے۔ مگر مذکورہ قسم کی سیاسی تحریکوں (خواہ وہ اسلام کے نعرہ پر اٹھی ہوں یا سیکولر نعرہ پر) دونوں کا مشترک نقصان یہ ہوا کہ جدید مسلم نسل کا ذہن سیاست کی طرف مڑ گیا اور اسلام کی دعوت اور اشاعت کے انتہائی قیمتی امکانات استعمال ہونے سے رہ گئے۔

میرے اندازے کے مطابق بغداد کا تازہ حادثہ زحمت کے بھیس میں رحمت (blessing in disguise) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس حادثہ نے نہ صرف عرب قومیت کی تحریک کو بلکہ خود سیاسی عملیت کے ذہن کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "بغداد" کے کھنڈر سے ایک نیا ذہن ابھرے گا۔ تمام دنیا کے مسلمان پچھلے سو سالہ طریق کار پر نظر ثانی کریں گے اور

سیاسی عملیت (political activism) یا عسکری عملیت (violent activism)
نقصان کو آخری حد تک محسوس کرکے اسے چھوڑ دیں گے اور عملیت دعوت (*dawah* activism)
کو اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اختیار کرلیں گے۔

اب تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے تمام لکھنے اور بولنے والے استعماری اور صلیبی اور صہیونی سازشوں (المؤامرات والمخططات) کی اصطلاح میں سوچتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے تمام موجودہ مسائل خارجی دشمنوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ یہ فکر یقینی طور پر ردعمل کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مبنی نہ تھا۔ کیوں کہ قرآن و سنت میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمہارے مسائل ہمیشہ داخلی غفلت کے نتیجہ میں پیدا ہوں گے نہ کہ خارجی سازشوں کے نتیجہ میں۔

خلیج کی جنگ نے اس وہم کا غبارہ توڑ دیا ہے۔ اب قوی امید ہے کہ انشاء اللہ مسلمان بے فائدہ مقابلہ آرائی کے طریقوں کو چھوڑ دیں گے۔ اور پوری طرح اس عمل کو اختیار کرلیں گے جس کو ہم نے دعوہ ایکٹوزم (*dawah* activism) کا نام دیا ہے۔

خلیج کی جنگ مسلمانوں کے دور غفلت کا خاتمہ اور ان کے دورِ عمل کا آغاز ہے۔ اور کسی انسانی گروہ کے لئے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی غفلت اور بے شعوری کو ختم کرکے حقیقی عمل کے میدان میں اپنی مثبت جدوجہد شروع کردے۔

تاریخ کے تمام بڑے واقعات بڑے بڑے حادثات کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ خلیج کا معاملہ بھی مجھے اسی قسم کا ایک حادثہ نظر آتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس برباد حال سے ایک نیا مستقبل ابھرے گا۔ ایسا ہونا اتنا یقینی ہے جتنا تاریک رات کے بعد روشن صبح کا آنا۔

داخلی اصلاح، خارجی انقلاب

تفکیر (thinking) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو خارج رخی (outward-oriented) تفکیر اور دوسری کو داخل رخی (inward-oriented) تفکیر کہا جا سکتا ہے۔ خارجی تفکیر میں نظام (system) کو ساری اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے خارجی ڈھانچہ کی تبدیلی کو سب سے بڑا کام بتاتی ہے۔ اس کے برعکس داخلی تفکیر میں ساری اہمیت انسانی فرد کو دی جاتی ہے۔ اس کی ساری توجہ اس پر ہوتی ہے کہ فرد کے اندرونی وجود میں مکمل داخلی انقلاب پیدا کر دے۔

موجودہ زمانہ میں جن تحریکوں کو عمومی شہرت ملی، وہ سب کی سب وہی ہیں جو خارجی تفکیر کی بنیاد پر اٹھائی گئیں۔ مگر حقیقی اسلامی تحریک وہ ہے جو داخلی تفکیر کی بنیاد پر اٹھے۔ جس کا نشانہ فرد ہو نہ کہ خارج میں پایا جانے والا اجتماعی ڈھانچہ۔ کیوں کہ خارجی ڈھانچہ اندرونی نظام کے تابع ہے، نہ کہ اندرونی نظام خارجی ڈھانچہ کے تابع۔ قرآن کے مطابق "نفس" کی سطح پر تغیر سے "قوم" کی سطح پر تغیر واقع ہوتی ہے (ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم) الرعد ۱۱)

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ تعداد اور عمل اور قربانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کی ظاہری مقدار تمام پیغمبروں کے مجموعی کام سے بھی زیادہ نظر آئے گی۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے تمام کی تمام تحریکیں بالکل صفر ہو کر رہ گئیں۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ یہ تحریکیں خارجی تفکیر کی بنیاد پر اٹھیں، جب کہ خدا کے قانون کے مطابق، نتیجہ خیز اسلامی عمل صرف وہ ہے جو داخلی تفکیر کی بنیاد پر انجام دیا جائے۔

ایک مثال

خلیج کے المیہ پر ایک ہندستانی عالم کی کتاب ۱۹۹۱ میں چھپی ہے۔ اس کا نام ہے: اکبر خطر علی العالم العربی (عالم عرب کے اوپر سب سے بڑا خطرہ) اس کا خلاصہ یہ ہے کہ البعث العربی کی تحریک جس کے زیر اثر بعث پارٹی وجود میں آئی، وہ عالم عرب کے لئے امریکہ اور برطانیہ کے تدخل سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ تحریک جزیرۃ العرب کو دوبارہ جاہلیت اولیٰ کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ حتی کہ وہ کار نبوت کے تمام بابرکت نتائج کو ختم کر دینا چاہتی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ عام مسلمان اس خطرناک

تحریک کے ارادوں اور منصوبوں سے واقف نہیں۔ مگر وہ خود اس سے براہِ راست، واقفیت رکھتے ہیں۔ اسی واقفیت کی بنیاد پر انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ البعث العربی، یا صدام حسین کی بعث پارٹی عالم اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے تو یہ بلاشبہ قرآن کی تنسیخ و تردید کے ہم معنی ہوگا۔ کیوں کہ قرآن کے نزول کی تکمیل کے بعد واضح طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ اب اہل کفر اور اہل باطل کی طرف سے تمہارے لئے خطرہ کا دور ختم ہوگیا۔ نزول قرآن اور تکمیل دین کے بعد اب کفر و باطل ناامیدی کے دور میں داخل ہو گئے ہیں اور اسلام اور اہل اسلام امید کے دور میں۔ اس لئے اے مسلمانو، تم دوسروں سے اندیشہ نہ کرو۔ اب تم کو صرف اللہ رب العالمین سے اندیشہ کرنا چاہئے:

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشونِ (المائدہ ۳)

آج کفر کرنے والے تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہوگئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، اور تم صرف مجھ سے ڈرو۔

التفسیر المظہری میں اس آیت کی تشریح میں یہ الفاظ درج ہیں:

(فلا تخشوھم) ان یظھروا علیکم و یبطلوا دینکم (واخشونِ) یعنی اخلصوا الخشیۃ لی ... وقیل اظھرت دینکم علی الادیان کلھا و آمنتکم من الاعداء (۳/ ۲۴ - ۲۵)

"ان سے نہ ڈرو" کہ وہ تمہارے اوپر غالب آجائیں گے اور تمہارے دین کو باطل کر دیں گے۔ اور "مجھ سے ڈرو" یعنی ڈر کو صرف میرے لئے خالص کردو۔ اور کہا گیا ہے کہ میں نے تمہارے دین کو تمام دینوں پر غالب کر دیا ہے اور تم کو دشمنوں سے محفوظ کر دیا ہے۔

تمام مفسرین نے اس آیت کی تشریح اسی انداز میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں مفسرین نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ مولانا عبد الماجد دریابادی کے الفاظ میں یہ ہے:

"یہ گویا وعدۂ الٰہی ہے کہ اب تشویش و تردد کی چیز غلبۂ کفر اور استیلاء کفار نہیں، بلکہ احکام شریعت سے تجاوز اور تزلزل ہے۔ یہی چیز ایسی ہے جو مسلمانوں کو ضرر پہنچا سکتی ہے۔ اور ان کے ملی وجود کے لئے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ خشیت الٰہی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کمی مسلمانوں میں ضعف پیدا کر سکتی ہے

نہ کہ اہل کفر کی کوئی خارجی قوت ۔ اور تاریخ و تجربہ نے اسے لفظ بلفظ صحیح ثابت کردکھایا ہے ۔ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں جب کبھی اور جہاں بھی ملت کو نقصان پہنچا ہے اپنے ہی ضعف ایمان سے ، بے عملی سے ، بدعملی سے خوف خدا کی کمی سے ۔ (تفسیر ماجدی ، جلد دوم ، صفحہ ۱۸۳)

دین ذریعۂ حفاظت

خدا کا دین جب حقیقی طور پر لوگوں کی زندگیوں میں قائم ہو تو وہ اہل دین کے لئے ہر خطرہ کے مقابلہ میں حفاظت کی گارنٹی ہوتا ہے ۔ قدیم زمانہ میں یہ حفاظت صرف اس وقت ہوتی تھی جب کہ ایک زندہ نبی قوم کے درمیان موجود ہو ۔ کیوں کہ نبی کی رحلت کے بعد دین اپنی محفوظ حالت میں باقی نہیں رہتا تھا ۔ اور جب دین محفوظ نہ ہو تو اس کے نتائج کیوں کر ظہور میں آسکتے ہیں ۔

مگر پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے دین کو قیامت تک کے لئے محفوظ کردیا ہے ۔ اس لئے دین کے ذریعہ اہل دین کی حفاظت کا انتظام بھی اب قیامت تک کے لئے قائم ہوگیا ہے ۔ اب مسلمانوں کے لئے خارجی دشمن سب سے بڑا خطرہ نہیں ۔ اب ان کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ داخلی طور پر ان کے اندر دین کی حقیقت باقی نہ رہے ۔ مسلمان اگر اللہ سے ڈرنے والے بن کر رہیں تو وہ اسی طرح اہل باطل کے فتنوں اور سازشوں سے محفوظ رہیں گے جس طرح نبیوں کے ماننے والے اپنے نبی کے دور حیات میں ان سے محفوظ رہتے تھے ۔

قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو آج مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ خطرہ کی حالت یہ ہے کہ مسلمان آج اللہ سے ڈرنے والا نہیں ۔ حتی کہ وہ لوگ بھی نہیں جو بظاہر دیندار مسلمان سمجھے جاتے ہیں ۔ اللہ کے خوف سے جو صفات پیدا ہوتی ہیں ، وہ صفات موجودہ مسلمانوں میں باقی نہیں رہیں ۔ آج مسلمانوں کے اندر وہ صفات آگئی ہیں جو اللہ سے بے خوفی کے تحت پیدا ہوتی ہیں ۔ یہ حالت صرف عوام کی نہیں ہے ، بلکہ خواص کی حالت بھی عملاً یہی ہے ۔ موجودہ مسلمانوں میں ظاہری اسلام کی دھوم ضرور ہے ، مگر خوف خدا والے اسلام کا ان کے اندر کوئی وجود نہیں ۔ الا ماشاء اللہ ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج مسلمانوں پر وہ وقت آگیا ہے جس کی آگاہی حدیث میں دی گئی تھی ۔ اس سلسلہ میں ایک روایت یہاں نقل کی جاتی ہے ۔

جبیر بن نفیر نے عوف بن مالک اشجعی کے واسطہ سے نقل کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز ہم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ علم اٹھالیا جائے گا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کہا جس کا نام زیاد بن لبید تھا، اے خدا کے رسول کیا ہم سے علم اٹھالیا جائے گا، حالاں کہ ہمارے درمیان خدا کی کتاب ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو اس کی تعلیم دے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو مدینہ کا سمجھ دار آدمی جانتا تھا۔ یہود ونصاریٰ کیا تورات وانجیل کو نہیں پڑھتے۔ پھر بھی ان کی باتوں پر ان کا عمل نہیں ہے۔

جبیر بن نفیر کی ملاقات شداد بن اوس سے ہوئی۔ انھوں نے ان کو یہ حدیث سنائی۔ انھوں نے کہا کہ عوف نے سچ کہا۔ پھر شداد نے کہا۔ جانتے ہو، علم کا اٹھ جانا کیا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ شداد نے کہا، اس کے برتن کا چلا جانا (ذھاب اوعیتہ) اس کے بعد شداد نے کہا:

ھل تدری ای العلم یُرفع، قال قلت لا ادری۔ قال الخشوع حتی لا یُریٰ خاشعا	کیا تم جانتے ہو کون سا علم اٹھالیا جائے گا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا: خشوع اٹھالیا جائے گا۔ یہاں تک کہ کوئی خاشع دکھائی نہ دے گا۔

(ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، ۱/۱۵۳)

اللہ کا خوف کوئی سادہ بات نہیں، اور نہ وہ زندگی سے غیر متعلق کوئی چیز ہے۔ اللہ کا خوف ایک کردار ساز طاقت ہے۔ جن لوگوں کے سینہ میں اللہ کا خوف ہو، وہ عین اس کے نتیجہ میں سنجیدہ انسان بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر تواضع کی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عہد کو پورا کرنے والے اور انصاف پر قائم ہونے والے بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی خواہش کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دیتے ہیں۔ اللہ کا خوف ان سے سرکشی اور بے راہ روی کا مزاج چھین لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ حق کی حمایت کرتے ہیں، خواہ وہ ان کے موافق ہو یا ان کے خلاف۔

یہ تمام اوصاف گویا خدائی ڈھال ہیں۔ یہ اوصاف جس گروہ کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائیں وہ اس کے لئے اس کے مخالفین کے مقابلہ میں حفاظت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ مگر موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے لئے اصل خطرہ کی بات یہ ہے کہ اس قسم کا دین ان میں موجود نہیں رہا۔ دین کے نام پر ان کے یہاں جو چیز ہے وہ کچھ ظواہر دین ہیں نہ کہ حقیقت دین۔

حفاظت کی صورتیں

اب اس قرآنی یقین دہانی کو موجودہ حالات پر چسپاں کیجئے اور دیکھئے کہ آج اگر مسلمانوں کے اندر خوف خدا والا اسلام زندہ ہوتا تو کس طرح انھیں خلیج جیسے کسی المیہ سے بچانے کا ذریعہ بن جاتا۔

۱۔ صدام حسین اور ان کے ساتھیوں کے اندر اگر اللہ کا ڈر ہوتا تو وہ قرآن کے حکم (۱۷: ۳۴) کے مطابق، عہد کی پابندی کرتے۔ عراق کی حکومت اور کویت کی حکومت کے درمیان ۱۹۶۳ میں باقاعدہ معاہدہ ہوا۔ اس کے تحت عراق نے یہ پابندی قبول کی کہ وہ کویت کو مستقل ملک کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے اور اس کی ۱۹۳۲ کی قائم کردہ سرحدوں کے احترام کا عہد کرتا ہے۔ اس کے باوجود عراق کے حکمرانوں نے اگست ۱۹۹۰ میں اچانک کویت کے اوپر حملہ کر دیا۔ عراق کے "مجاہدین اسلام" اگر اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو وہ کبھی

اتفاقية ١٩٦٣ حول الحدود بين الكويت والعراق

استجابة للرغبة التي يحس بها الطرفان في ازالة كل ما يشوب العلاقات بين البلدين، اجتمع الوفد الكويتي الرسمي الذي يزور الجمهورية العراقية بدعوة من رئيس وزرائها بالوفد العراقي وذلك في بغداد في اليوم الرابع من اكتوبر (تشرين الاول) عام ١٩٦٣.

وكان الوفد الكويتي يتألف من:

١. سمو الشيخ صباح السالم الصباح ولي العهد ورئيس مجلس الوزراء.
٢. سعادة الشيخ سعد العبد الله السالم الصباح وزير الداخلية ووزير الخارجية بالوكالة
٣. سعادة السيد خليفة خالد الغنيم وزير التجارة.
٤. سعادة السفير عبد الرحمن سالم العتيقي وكيل وزارة الخارجية.

وكان الوفد العراقي يتألف من :

١. اللواء السيد احمد حسن البكر رئيس الوزراء.
٢. الفريق الركن السيد صالح مهدي عماش وزير الدفاع ووزير الخارجية بالوكالة.
٣. الدكتور محمود محمد الحمصي وزير التجارة.
٤. السيد محمد كبارة وكيل وزارة الخارجية.

وقد جرت المباحثات بين الوفدين في جو مفعم بالود الاخوي والتمسك برابطة العروبة والشعور باواصر الجوار وتحسس المصالح المشتركة.

وتاكيدا من الوفدين المجتمعين على رغبتهما الراسخة في توطيد العلاقات لما فيه خير البلدين بوحي من الاهداف العربية العليا. وايمانا بالحاجة لاصلاح ما ران على العلاقات العراقية - الكويتية نتيجة موقف العهد القاسمي البائد تجاه الكويت قبل ثورة الرابع عشر من رمضان ويقينا بما يمليه الواجب القومي من فتح صفحة جديدة من العلاقات بين الدولتين العربيتين تتفق وما بينهما من روابط وعلاقات ينحسر عنها كل ظل لتلك الفجوة التي اصطنعها العهد السابق في العراق. وانطلاقا من ايمان الحكومتين بذاتية الامة العربية وحتمية وحدتها وبعد ان اطلع الجانب العراقي على بيان الكويت الذي في مجلس الامن الكويتي بتاريخ ٩ ابريل (نيسان) ١٩٦٣ والذي تضمن رغبة الكويت في العمل على انهاء الاتفاقية المعقودة مع بريطانيا في الوقت المناسب.

اتفق الوفدان على ما يلي:

اولا - تعترف الجمهورية العراقية باستقلال دولة الكويت وسيادتها التامة بحدودها المبينة بكتاب رئيس وزراء العراق بتاريخ ٢١ يوليو (تموز) ١٩٣٢ والذي وافق عليه حاكم الكويت بكتابه المؤرخ ١٠ اغسطس (آب) ١٩٣٢.

ثانيا - تعمل الحكومتان على توطيد العلاقات الاخوية بين البلدين الشقيقين يحدوهما في ذلك الواجب القومي والمصالح المشتركة والتطلع الى وحدة عربية شاملة.

ثالثا - تعمل الحكومتان على اقامة تعاون ثقافية وتجاري واقتصادي بين البلدين وعلى تبادل المعلومات الفنية بينهما.

وتحقيقا لذلك يتم فورا تبادل التمثيل الديبلوماسي بين البلدين على مستوى السفراء.
واشهادا على ذلك وقع كل من رئيسي الوفدين على هذا المحضر.

رئيس الوفد الكويتي	رئيس الوفد العراقي
صباح السالم الصباح	اللواء احمد حسن البكر

Al-Majallah, London, 17-23 April 1991, p.20

ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ سے ڈرنے والا عہد کو پورا کرنے والا ہوتا ہے نہ کہ عہد کو توڑنے والا۔

۲۔ عراق نے اس سے پہلے ستمبر ۱۹۸۰ میں ایران پر حملہ کیا۔ یہ واضح طور پر ایک مسلم ملک کی دوسرے مسلم ملک کے اوپر جارحیت تھی۔ یہ جارحیت آٹھ سال تک جاری رہی۔ مگر مسلم دنیا کے علماء میں سے کسی بھی قابل ذکر شخصیت نے اس جارحیت کی مذمت نہیں کی۔ تمام علماء اور "اکبر خطر علی العالم العربی" جیسی کتابیں لکھنے والے تمام لوگ اس وقت آیات اللہ خمینی کے خلاف بیان اور مضمون اور کتاب چھاپنے میں مشغول رہے جو بالواسطہ طور پر صدام حسین کی حمایت اور اس کی حوصلہ افزائی کے ہم معنی تھا۔

ہمارے علماء اگر فی الواقع اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو قرآن کے حکم عدل کے مطابق، وہ ایران کے خلاف عراقی حکمراں کی جارحیت کی مذمت کرتے، جس طرح بعد کو انھوں نے کویت کے خلاف اس کی جارحیت کی مذمت کی۔ اگر تمام علماء اور تمام اکابر ملت ۱۹۸۰ میں صدام حسین کی پہلی جارحیت کی کھل کر مذمت کرتے تو عین ممکن تھا کہ صدام حسین کو دوبارہ کویت کے خلاف اس قسم کی جارحیت کا حوصلہ نہ ہو۔

۳۔ اگست ۱۹۹۰ میں عراقی حکمراں صدام حسین نے ایک لاکھ سے زیادہ فوج کویت کے اندر داخل کر دی اور ایک پڑوسی ملک پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ مگر دنیا بھر کے پچاس سے زیادہ مسلم حکمراں اس معاملہ میں کچھ بھی نہ کر سکے۔ حتی کہ انھوں نے یہ بھی نہیں کیا کہ متفقہ طور پر اس ظلم اور جارحیت کے خلاف آواز بلند کریں۔

اگر ان مسلم حکمرانوں میں اللہ کا خوف ہوتا تو یقینی طور پر وہ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی حمایت پر متحرک ہو جاتے۔ مثلاً پہلی فرصت میں تمام کے تمام حکمراں کسی مقام پر جمع ہو کر مشورہ کرتے۔ وہ بغداد جا کر صدام حسین کے اوپر متفقہ انداز میں دباؤ ڈالتے اور اس طرح اس کو مجبور کرتے کہ وہ کویت سے اپنی فوجیں واپس بلا لے۔

بالفرض اگر اس قسم کا عملی اقدام ممکن نہیں تھا تو اتنا تو لازمی طور پر ہونا چاہئے تھا کہ تمام مسلم حکمراں کامل اتفاق رائے کے ساتھ صدام حسین کے خلاف مذمت کی قرارداد پاس کریں۔ مگر خلیجی بحران کے معاملہ میں وہ نہ عمل کی سطح پر کوئی متفقہ کارروائی کر سکے اور نہ قول کی سطح پر۔ حالاں کہ اگر ایسا ہوتا کہ صدام حسین اس معاملہ میں تمام مسلم حکمرانوں کی حمایت کھو دیتا تو ناممکن تھا کہ اس کے بعد وہ کویت کے خلاف اپنی جارحیت پر قائم رہ سکے۔

مسلم حکمرانوں نے کوئی ایک یا دوسری وجہ بتا کر مشترکہ میز پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ حالاں کہ اگر وہ

اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو وہ کہتے کہ یہ نازک موقع ہے جب کہ ہم آپس کے اختلافات کو مٹا کر اپنے مظلوم بھائی کی مدد کریں اور کسی بھی وجہ کو متحدہ کارروائی میں رکاوٹ نہ بننے دیں۔

۴۔ یہی معاملہ مسلم عوام کا ہے۔ آج اگر مسلم عوام میں وہ دین زندہ ہوتا جو تقویٰ اور خشیت کے اوپر قائم ہوتا ہے تو ساری دنیا کے مسلمان تڑپ اٹھتے۔ وہ کہتے کہ اسلام میں کسی مسلمان کی چیز دوسرے مسلمان کے لئے حرام ہے۔ پیغمبر اسلام نے تو اس سے بھی منع فرمایا ہے کہ کوئی مسلمان اپنے بھائی کے سامنے ہتھیار کھولے۔ ایسی حالت میں یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ایک مسلم ملک دوسرے مسلم ملک میں اپنی فوجیں داخل کرکے اس کے اوپر ناحق قبضہ کرلے۔

اگر موجودہ مسلمان اللہ سے ڈرنے والے ہوتے تو تمام مسلمان اس معاملہ میں صدام حسین کے مخالف ہو جاتے۔ وہ صدام حسین کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے۔ وہ خط اور تار اور ٹیلیفون کے ذریعہ صدام حسین پر زور ڈالتے کہ وہ اس عمل بد سے باز رہے۔ اگر مسلمانوں کے اندر خوف خدا ہوتا تو صدام حسین کو ساری دنیا میں ایک شخص بھی اپنی حمایت کرنے والا نہ ملتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو یقینی طور پر صدام حسین کے حوصلے پست ہو جاتے۔ وہ مجبور ہو جاتا کہ کویت کو خالی کردے اور اپنی فوجوں کو وہاں سے واپس بلالے۔ ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کی حمایت بلاشبہہ خدا ترسی کی علامت ہے۔

مگر مذکورہ کاموں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امت کے مختلف طبقات میں سے کوئی ایک طبقہ بھی خشیت الٰہی کی سطح پر قائم نہیں۔ اور یہی کمی، نہ کہ کوئی خارجی سازش، وہ اصل سبب ہے جس نے صدام حسین کا مسئلہ اور اس جیسے دوسرے خطرناک مسائل ہمارے لئے موجودہ زمانہ میں پیدا کر دئے ہیں۔

پر امن طاقت

خشیت الٰہی کا معاملہ محض روایتی عقیدہ کا معاملہ نہیں، اس کی حیثیت تمام انقلابی اصولوں سے زیادہ بڑے انقلابی اصول کی ہے۔ اللہ کی خشیت جب کسی انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ اس کی پوری شخصیت کو بدل دیتی ہے۔ وہ انسان کو بے راہ روی سے ہٹا کر راہ راست پر ڈال دیتی ہے۔ وہ انسان کو مکمل طور پر اصلاح یافتہ انسان بنا دیتی ہے۔

اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خشیت کا اصول پر امن تبدیلی کا اصول ہے۔ وہ امن کی طاقتوں

کو متحرک کر کے انسانیت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ امن کی طاقت تشدد کی طاقت کے مقابلہ میں، بہت زیادہ بڑی اور بہت زیادہ اثر انگیز ہے۔

اوپر ہم نے دکھایا ہے کہ اگر موجودہ مسلمانوں میں خشیت الٰہی کی روح زندہ ہوتی تو خلیج کا مسئلہ کتنے اعلیٰ طریقے پر حل ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس تشدد کی طاقت کی بے اثری کو دیکھئے۔ امریکہ نے دوسری قوموں کو ساتھ لے کر خلیج کے مسئلہ کو تشدد کے ذریعہ حل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اس مسئلہ کے حل کے لئے تشدد کا استعمال اتنے بڑے پیمانہ پر کیا جو تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے نہ صرف عراق کو بلکہ کویت کو اور بالواسطہ طور پر خلیج کے پورے علاقہ کو ایسے تباہ کن مسائل میں مبتلا کر دیا جس سے نکلنے کے لئے پچاس برس کی مدت بھی شاید کافی نہیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ حربی طاقت کے بے پناہ استعمال کے باوجود امریکہ کا اصل مقصد پورا نہیں ہوا۔ ٹائم میگزین (۳ جون ۱۹۹۱) نے صفحہ ۳۰-۳۱ پر اس معاملہ میں امریکہ کا ایک جائزہ چھاپا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ خلیج کے آفت زدہ علاقہ کی نئی حقیقتوں نے امریکہ کے اس خواب کو مایوسی میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ شرق اوسط میں ایک نیا نظام قائم کرے:

U.S. dreams of helping build a new Middle East Order are frustrated by the realities of a troubled and troubling region (p. 30).

ٹائم میگزین نے امریکہ کے شہروں میں ایک اوپی نین پول کرایا۔ اس کا ایک سوال یہ تھا کہ عراق کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے، عراق سے امریکہ کی جنگ کس حد تک کامیاب رہی:

Given the current events in Iraq, how successful was the war with Iraq?

اس سوال کے جواب میں سات فی صد امریکیوں نے کہا کہ (not at all) یعنی جنگ کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔ ۴۶ فیصد لوگوں نے کہا کہ (only partly) یعنی یہ جنگ صرف جزئی طور پر کامیاب ہوئی (صفحہ ۳۱)

اس جنگ میں امریکہ کا اصل نشانہ صدام حسین تھا۔ اور ساری تخریب کے باوجود، وہ بدستور اپنی کرسی پر باقی ہے۔ اپنی جنگی کارروائی کے آخر میں پہنچ کر امریکہ کو یہ مسئلہ پریشان کر رہا ہے کہ اگر وہ مزید

کارروائی کر کے صدام حسین کا خاتمہ کر دے تو موجودہ حالات میں اس کا الٹا نتیجہ نکلے گا۔ کیوں کہ صدام کے بعد عراق میں شیعہ قیادت ابھر آئے گی۔ اس کے بعد ایران کا اثر اس علاقہ میں بہت بڑھ جائے گا۔ ایران، امریکہ کا سب سے بڑا دشمن ہے، اور ایران کا بڑھنا، امریکہ کے لئے، چھوٹے دشمن کو مار کر بڑے دشمن کو زندہ رکھنے کے ہم معنی ہے۔

یہ تشدد کے طریقہ کی بے اثری ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کا جو پر امن طریقہ ہے وہ کوئی نئی پیچیدگی پیدا کئے بغیر مسئلہ کو حل کرتا ہے، جب کہ دوسرے طریقوں کا حال یہ ہے کہ وہ ایک مسئلہ کو حل کرنے کے نام پر مزید شدید تر مسائل پیدا کر دیتے ہیں۔

داخلی کمی کا مسئلہ

مذکورہ قرآنی تشخیص کے مطابق، اس وقت کرنے کا کام یہ نہیں ہے کہ بیرونی خطروں اور سازشوں کا انکشاف کیا جائے۔ اس کے بجائے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ملت کے افراد میں خشیت الٰہی کی روح پیدا کی جائے۔ تعلیم و تربیت کے تمام ذرائع کو استعمال کر کے مسلمانوں کو نفسیاتی اعتبار سے اس مقام پر لایا جائے جہاں وہ، قرآن کے الفاظ میں، فلا تخشوھم واخشونِ کا مصداق بن جائیں۔ وہ خشیتِ غیر خدا پر کھڑے ہونے کے بجائے خشیت خدا پر کھڑے ہو جائیں۔ اسی کے ذریعہ پہلے بھی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوا تھا اور اسی کے ذریعہ آج بھی ان کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے (لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا، امام مالک)

حقیقت یہ ہے کہ خلیج کے المیہ نے عرب قومیت یا صلیبی اور صہیونی جیسے خارجی خطروں کو بے نقاب نہیں کیا ہے۔ بلکہ خود ملت مسلمہ کی اس داخلی کمی کو بے نقاب کیا ہے کہ وہ اپنے اصل مقام سے ہٹ گئی ہے۔ اس کو حقیقۃً خشیت الٰہی کے اوپر کھڑا ہونا چاہئے، مگر عملاً آج وہ اس سے دور ہے۔ یہ دوری یہاں تک پہنچی ہے کہ اس کے علماء تک اس سے واقف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء اور دانشور اس کو خوف اغیار کے خطرہ کی آگاہی دے رہے ہیں۔ ایسا کوئی نہیں جو اس کو خدا سے بے خوفی کے خطرہ سے متنبہ کرنے کا کام انجام دے رہا ہو۔

موجودہ زمانہ میں عالمی سطح پر جو تحریکیں اٹھیں، مثلاً ڈیموکریسی، سوشلزم وغیرہ، ان سب کا زور خارجی سسٹم کو بدلنے پر تھا، فرد کے اندر انقلاب لانا، ان میں سے کسی کا نشانہ نہیں تھا۔ اسی سے

مسلمانوں کی وہ تمام تحریکیں بے ست اثر ہو گئیں، جن کے مجموعہ کو آجکل "صحوہ اسلامیہ" کہا جاتا ہے۔ صحوہ اسلامیہ کے تحت مسلمانوں کی جو انقلابی تحریکیں ساری دنیا میں چل رہی ہیں، ان سب نے خارجی نظام کو اپنا نشانہ بنا رکھا ہے۔ داخلی انقلاب ان میں سے کسی کا نشانہ نہیں۔ یہی خاص کمزوری ہے جس کی بنا پر ہم آج یہ صورت حال دیکھ رہے ہیں کہ طوفان خیز اسلامی سرگرمیوں کے باوجود نتیجہ بالکل صفر ہے۔ کیوں کہ نتیجہ خشیت خدا پر نکلتا ہے نہ کہ خشیت غیر خدا پر۔

پریس کا المیہ

ذہنی بگاڑ کی جس خرابی سے آج ہم دوچار ہیں، اس کو اتنا زیادہ عام کرنے میں سب سے زیادہ دخل پریس کا ہے۔ پریس کا دور اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت تھا، مگر مسلمانوں نے اپنی نادانی سے اس کو اپنے لئے ایک زحمت بنالیا۔

انیسویں صدی میں جب پریس کا دور آیا تو یہ زمانہ وہ تھا جب کہ مسلمان ساری دنیا میں خارجی قوموں کے مقابلہ میں مغلوبیت کا شکار ہو رہے تھے۔ اس وقتی سبب کے تحت مسلم پریس کا رخ "خارجی خطرہ" کی طرف ہوگیا۔ نہ صرف اخبارات ورسائل بلکہ کتابیں بھی جو اس دور میں چھاپی گئیں وہ بھی اسی کے زیر اثر خارجی تفکیر کی نمائندگی کرنے والی تھیں۔ داخلی تفکیر جو حقیقی اسلامی تفکیر ہے، اس کی نمائندگی دور پریس میں کم از کم موثر انداز میں بالکل نہ ہو سکی۔

اس کے نتیجہ میں ایک بہت بڑی برائی ساری مسلم دنیا پر مسلّط ہے۔ وہ یہ کہ خارجی تفکیر کے حق میں علمی فضا پوری مسلم دنیا میں بخوبی طور پر پائی جاتی ہے، مگر داخلی تفکیر کے حق میں علمی فضا مسلم دنیا میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ چنانچہ خارجی عمل کو لوگ بڑا اور اہم کام سمجھتے ہیں اور داخلی عمل کو چھوٹا اور غیر اہم کام۔

مثال کے طور پر آج جب ایک آدمی جہاد وقتال کی بات کرتا ہے تو مسلمان اس کی اہمیت کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ کیوں کہ پچھلے سو سال کے اندر مسلم پریس اور مسلم پلیٹ فارم سے جہاد وقتال کو مبالغہ آمیز حد تک گلوریفائی کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس اگر مسلمانوں کے سامنے صبر اور اعراض کی بات کہی جائے تو اس کی اصولی اہمیت ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ وہ صبر و اعراض کی روش کو بزدلی قرار دے کر اسے نظرانداز کر دیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پریس کی سو سال کی مدت میں کوئی بھی قابل ذکر مسلمان نہیں اٹھا جو اسلام

کی اس اہم تعلیم کو علمی اور فکری سطح پر مدلل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جہاد و قتال کے حق میں علمی فضا موجود ہے، مگر صبر و اعراض کے حق میں علمی فضا سرے سے موجود ہی نہیں۔

عصری افکار کی مساعدت

اوپر جن دو قسم کی اسلامی تحریکوں کا ذکر کیا گیا، ان کو ممیز کرنے کے لئے ان میں سے ایک کو انقلابی اسلامی تحریک اور دوسرے کو ربانی اسلامی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ انقلابی اسلام کا نعرہ لے کر اٹھتے ہیں، ان کو بہت جلد تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنے ہمنوا افراد مل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص ربانی اسلام کا پیغام لے کر اٹھے، وہ تعلیم یافتہ طبقہ میں بہت کم افراد کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

اس فرق کا سبب خود انقلابی اسلام کے علمبرداروں کی ذاتی لیاقت نہیں ہے۔ اس کا سبب دراصل زمانہ کی مساعدت ہے۔ ان کا پیغام اس ذہنی ڈھانچہ کے مطابق ہے جو پہلے سے لوگوں کے اندر پایا جا رہا ہے۔ چنانچہ انقلابی اصطلاحوں میں بولنے والوں کی بات فوراً ان کی سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں ڈیموکریسی اور سوشلزم وغیرہ کے نام سے جو تحریکیں اٹھیں، ان سب کا فکر مبنی بر نظام (SYSTEM BASED) فکر تھا۔ ان تحریکوں کی پشت پر دور جدید کی بڑی بڑی حکومتیں اور انتہائی بڑے بڑے ادارے تھے۔ انھوں نے اعلیٰ ترین ذرائع کو استعمال کر کے عالمی سطح پر لوگوں کے ذہنوں کی تشکیل کی۔ ساری دنیا کے تعلیم یافتہ لوگ اس انداز پر سوچنے لگے کہ انسانیت کی تعمیر کے لئے اصل کام اجتماعی ڈھانچہ میں تبدیلی لانا ہے۔ اس طرح نظامی طرز فکر وقت کا غالب طرز فکر بن گیا۔

اب ایک شخص جب اسلام کی دعوت کو سیاسی اور انقلابی اصطلاحوں میں بیان کرتا ہے تو ایسی دعوت لوگوں کے لئے ایک مانوس دعوت بن جاتی ہے۔ ذہنی رجحان کے اعتبار سے، وہ وقت کے شاکلہ کے عین مطابق ہوتی ہے۔ ایسی آواز فوراً لوگوں کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ وہ بڑھ کر اس کو قبول کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس ربانی اسلام کی بات آج کے علمی ماحول میں بالکل اجنبی ہے۔ اس کے حق میں نہ عالمی ذہنی فضا موجود ہے اور نہ مسلم مفکرین نے اس کی پشت پر علمی دلائل کا زور جمع کیا ہے۔ اس بنا پر آج کے انسان کے لئے ربانی اسلام کا پیغام ایک اجنبی پیغام بن جاتا ہے۔ ان میں بہت کم افراد ایسے ملتے ہیں جو ربانی اسلام کی معنویت کو سمجھیں اور دل کی گہرائی کے ساتھ اس کو قبول کریں۔

علمی تائید کی ضرورت

اوپر کی تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں خارجی تفکیر کی مقبولیت کیوں ہے۔ اور اس کے مقابلہ میں داخلی تفکیر کو ان میں قبول عام کیوں حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ مثال کے طور پر تبلیغی جماعت کو لیجئے۔ وہ ایک ایسی جماعت ہے جس کو اپنی نوعیت کے اعتبار سے داخلی تفکیر کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ مگر تجربہ بتاتا ہے کہ اس کا کام زیادہ تر عوامی طبقہ کے لوگوں میں محدود ہے۔ تقریباً سو سال کی محنت کے باوجود ابھی تک وہ خواص کے طبقہ میں نفوذ حاصل نہ کر سکا۔ طبقۂ خواص کا کوئی آدمی اگر تبلیغ کے قریب آتا ہے تو وہ بھی برکت کے لئے آتا ہے نہ کہ حقیقۃً دینی جذبہ کی بنا پر۔

اس کا سبب یہ ہے کہ "تبلیغ" یا داخلی نوعیت کے کام کے حق میں علمی اور فکری فضا موجود نہیں۔ اور جس مشن کی پشت پر علمی افکار کا وزن شامل نہ ہو، وہ خواص کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔

ایک تعلیم یافتہ آدمی نے تبلیغی جماعت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "تبلیغ والوں نے پہلے میواتیوں کو مسلمان بنایا، اب وہ تمام مسلمانوں کو میواتی بنا رہے ہیں"۔ یہ تبصرہ صحیح نہیں۔ تاہم اس تبصرہ کا پس منظر یہی مذکورہ صورت حال ہے۔ وہ قائل کی اپنی ذہنی حالت کو بتا رہا ہے نہ کہ تبلیغ کی واقعی حقیقت کو۔

"تبلیغ" یا بالفاظ دیگر، داخلی تفکیر والے کام کے حق میں آج علمی تصدیقات کا وزن شامل نہیں۔ خشیت اغیار کے موضوع پر بے شمار لٹریچر ہر زبان میں چھپا ہوا موجود ہے۔ مگر خشیت خدا کے موضوع پر کوئی طاقتور لٹریچر سرے سے دور پریس میں تیار ہی نہیں کیا گیا۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ ماحول میں خارجی تفکیر پر مبنی کاموں کو فوراً اہمیت حاصل ہو جاتی ہے، جب کہ داخلی تفکیر پر مبنی کسی کام کو اٹھایا جائے تو لوگ اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ اپنے موجودہ ذہنی سانچہ کی بنا پر انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ تمام مسلمانوں کو "میواتی" بنایا جا رہا ہو۔

یہ ایک نہایت سنگین خلا ہے جس کو پر کرنا انتہائی طور پر ضروری ہے۔ آج ضرورت ہے کہ داخلی تفکیر کے حق میں مضبوط علمی فضا تیار کی جائے۔ داخلی انداز کار کو ایک باوزن کام کی حیثیت سے دنیا کے سامنے لایا جائے۔ پریس کی طاقت، جس کو اب تک صرف خارجی تفکیر کے حق میں استعمال کیا گیا ہے، اس کو مزید شدت کے ساتھ داخلی تفکیر کے حق میں استعمال کیا جائے۔ جب تک یہ کام نہ ہوگا، قوم کا ذہین طبقہ (انٹلکچول کلاس) دین کی طرف مائل نہ ہوگا۔ جب کہ یہی ذہین طبقہ ہے جو سوسائٹی کا رہنما ہوتا ہے۔

ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN: 978-81-7898-646-3

9 7881 7898 6463